Regd.# MC-1366

دینی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کا علمبردار

ماہنامہ فہمِ دین

•جلد 15/•شمارہ 9/•اپریل/2026

پیمانہ

سادہ سی سلطنت

امت کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو وصیتیں

مایوسی کیوں؟؟

قرض دار

BAITUSSALAM PUBLICATIONS

91400056741

Baitussalam.org Baitussalam_org Baitussalam_org +9221-111-298-111

BAITUSSALAM

BAITUSSALAM TECH PARK

BAITUSSALAM
—TECH PARK—

بیت السلام ٹیک پارک

فری آئی ٹی کورسز

FREE IT COURSES

WHATSAPP: **+92 333 0189367**

EMAIL: **techpark@baitussalam.org** WEBSITE: **baitussalam.org/tech-park**

ماہ نامہ
فہمِ دین
کراچی

اپریل 2026ء | شوال/ذوالقعدہ1447ھ

فہم وفکر
مایوسی کیوں؟؟ — مدیر کے قلم سے — 04

اصلاحی سلسلہ
فہم قرآن — شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم — 05
فہم حدیث — مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ — 06
آئینہ زندگی — حضرت مولانا عبد الستار حفظہ اللہ — 08

مضامین
حرمتِ ذوالقعدہ — ریا نور رضوان — 10
خواتین اور ادب — حفصہ سلطان — 11
کیاہم واقعی موحد ہیں — ڈاکٹر خنسا — 12
ناریل — حکیم شمیم احمد — 14
جرنیلِ اسلام — سعدیہ اجمل — 15
اپریل فول — دانیال حسن چغتائی — 16
تعلیم یافتہ عورت — آمنہ عبد الباسط — 17

خواتینِ اسلام
محبت کی جیت — ثانیہ ساجد — 19
امید کا دیا — نکہت فرمان — 20
قرض دار — انیسہ عائش — 23
ابوجی — فاکہہ قمر — 24
پیمانہ — عالیہ ذوالقرنین — 27
سادہ سی سلطنت — اُمِ محمد سلمان — 28
بنت المارں — ساجدہ بتول — 30
دستِ مسیحا — میر جواد تالپر — 33

باغیچہ اطفال
جستجو — ملائکہ سلیمان — 35
جنت کے مسافر — ساجدہ امیر — 36
پہلا قطرہ — عبد الحفیظ شاہد — 37
فن پارے — 40
شانی کے جوتے — حفصہ محمد فیصل — 38
خوشی نگر کی سنہری دوڑ — مہوش اشرف — 39
انعامات ہی انعامات — 41

بزم ادب
بلند اوصاف سے وُسطیٰ، انہیں کندن بنانا ہے — حافظہ وسطیٰ چودھری — 42
سر پہ چادر سویرا یہ دائم رہے — حافظہ سویرا چودھری — 43
قلم پارے — ترتیب: محمود سیماب — 44

اخبار السلام
اخبار السلام — ادارہ — 50

زیرِ سرپرستی
حضرت مولانا عبد الستار حفظہ اللہ

مدیر: قارئ عبد الرحمن
نظرثانی: طارق محمود
تزئین وآرائش: فیضان الحق شمسی

آراء وتجاویز کے لیے
+92 335 1135011

اشتہارات کے لیے
0314-2981344
marketing@fahmedeen.org

26-C گراؤنڈ فلور بن سیٹ کمرشل اسٹریٹ نمبر 2، خیابانِ جامی، بالمقابل بیت السلام مسجد، ڈیفنس فیز 4 کراچی

ناشر: فیصل زبیر
مطبع: واسا پرنٹر
مقام اشاعت: دفتر فہم دین

مدیر کے قلم سے

مایوسی کیوں؟؟

جو سہولتیں اور وسائل آج دستیاب ہیں، ماضیِ بعید میں تو خیر ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، ماضیِ قریب میں بھی ایسی آسانیاں میسر نہ تھیں۔ آج موسموں کو مات دیتی ٹیکنالوجی، مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرنے والے ذرائع اور دنیا بھر کے حالات ہتھیلی پر دستیاب ہونے کے باوجود قوم مایوسی کے اتھاہ اندھیروں میں ہے؛ جس کی ماضی میں مثال نہیں ملتی۔

مایوسی کسی عارضی کیفیت کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک مہلک روحانی اور نفسیاتی مرض ہے جو انسان کی صلاحیتوں کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے۔ ناامیدی انسان کے ارادوں کو کمزور کردیتی ہے؛ یہ وہ زہرِ قاتل ہے جو کسی قوم کے اجتماعی وجود کو مفلوج کردیتا ہے۔ جو قوم مایوسی کا شکار ہوجائے، بھلا اس کے زوال کے لیے دشمن کو کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ذیل میں ان چند وجوہ پر نظر ڈالتے ہیں جن کی بنا پر ہمارے معاشرے کی اکثریت مایوسی کا شکار ہے:

انصاف کی عدم دستیابی: کسی بھی معاشرے کی اساس عدل وانصاف پر ہوتی ہے۔ جب ریاست اپنے شہریوں کو یہ باور کرانے میں ناکام ہوجائے کہ ان کی جان، مال اور آبرو محفوظ ہے اور کسی بھی زیادتی کی صورت میں انہیں بلا تفریق انصاف ملے گا، تو مایوسی جنم لیتی ہے۔ جب طاقتور کھلے عام قانون کا مذاق اڑائے، تو مظلوم کا عدل پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

معاشی تنگدستی: معیشت انسانی زندگی کی شہ رگ ہے۔ جب ایک قابل اور تعلیم یافتہ نوجوان کے لیے نہ صرف ڈگری بلکہ تجربہ بھی کافی نہ ہو اور ساتھ سفارش ورشوت بھی ضروری ٹھہرے، تو ظاہر ہے مایوسی راہ پائے گی۔

میرٹ کی پامالی: جب میرٹ صرف اشتہارات تک محدود رہ جائے اور اہلیت کا دعویٰ صرف فائلوں کا پیٹ بھرنے کے لیے ہو، تو مایوسی اپنا گھیرا تنگ کرلیتی ہے۔

اشرافیہ کی عیاشی: یہاں طبقاتی فرق اس قدر واضح ہوچکا ہے کہ عام شخص اور اشرافیہ کے فرق کو کسی نسبت سے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ایک طرف وہ طبقہ ہے جو دو وقت کی روٹی کو ترستا ہے، اور دوسری طرف وہ اشرافیہ ہے جس کی بے جا عیاشیاں اور نمود و نمائش غریب کے زخموں پر نمک چھڑکتی ہے۔ ایسے حالات میں نہ صرف مایوسی جنم لیتی ہے بلکہ انتقام کا جذبہ ابھرنے لگتا ہے۔

خود غرضی اور بے حسی: یہاں "میں" کا کلچر عام ہوچکا ہے۔ ہر شخص صرف اپنے مفاد کی سوچ رہا ہے، چاہے اس سے دوسروں کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچے۔ خیر خواہی اور سماجی ذمہ داری کا احساس ختم ہوتا جارہا ہے۔ یہ اخلاقی دیوالیہ پن پورے معاشرے کو ایسی تنہائی کی طرف لے جارہا ہے جہاں ہر شخص دوسرے سے خوفزدہ اور مایوس ہے۔

مایوسی کا سبق دینے والوں کا تو مشن ہی یہ ہے کہ ہر جگہ قانون شکنی کی مثالیں عام رہیں، رشوت کی وبا سے چھٹکارے کی بظاہر کوئی شکل نہ رہے اور ناقدری وناانصافی سامنے کی چیزیں بن جائیں۔

ان حالات کو دیکھ کر اگر سب لوگ اسی راستے پر چل پڑیں تو خرابیاں ہی بڑھیں گی اور ہم ایک ایسے جنگل کے قانون کی طرف لوٹ جائیں گے جہاں صرف طاقتور ہی زندہ رہ سکے گا۔

لیکن کیا اس مایوسی کا کوئی حل نہیں؟ کیا ہم ہمیشہ اس تاریکی میں بھٹکتے رہیں گے؟ ہرگز نہیں۔ اگر خود پر جبر کرکے مناسب تدبیر کے ساتھ ان مسائل سے نمٹنے کی کوشش جاری رکھی جائے، تو ایسے قافلے کا حصہ بننا نصیب ہوگا جو بچ کر چلنے کی مشق کرتا اور آگے بڑھتا ہے۔ یہاں بچ کر چلنے سے مراد برائی کا حصہ بننے سے انکار کرنا اور آگے بڑھنے سے مراد مسلسل جدوجہد کرنا ہے۔

چلیے، ایک منظر سے اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک پختہ اور خوبصورت سڑک کا تصور کیجیے جس کے دونوں جانب بلند و بالا درخت ہوں۔ یہ سڑک منزل کی جانب جاتی ہے، مگر بیچ میں پہاڑی موڑ اور درختوں کا ہجوم ہے۔ دور سے دیکھنے پر مسافر کو یہی لگتا ہے کہ تھوڑا آگے جاکر راستہ ختم ہوجائے گا۔ اگر وہ یہی سوچ کر گاڑی موڑلے تو منزل سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوکر بھٹکتا رہے گا۔ لیکن اگر وہ سفر جاری رکھے، تو جوں جوں آگے بڑھے گا، اسے راستہ کھلا ملے گا۔ ہر موڑ کے بعد ایک نیا منظر ہوگا، ہر بل کے بعد سڑک مزید وسیع ہوگی اور آخر کار وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جائے گا۔

یہی مثال ہمارے معاشرے کی ہے۔ حالات کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں، حل موجود ہے۔ سب سے پہلے ہمیں انفرادی سطح پر تبدیلی کا آغاز کرنا ہوگا۔ مایوسی کو خود پر طاری کرنے کے بجائے ہمیں اپنے دائرہ اختیار میں ایمانداری اور محنت سے کام کرنا ہوگا۔ اگر ہر سرپرست اپنے گھر کے افراد کی تربیت اور ان کی زندگی کو آسان بنانے میں اپنا مثبت کردار ادا کرے، تو نظام خود بخود درست ہونا شروع ہوجائے گا۔

ریاستی اداروں کو بھی اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا ہوگا۔ انصاف کی فوری فراہمی، میرٹ کی بالادستی اور جزا وسزا کے نظام کا نفاذ حکومت کی اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ جب تک قانون کی حاکمیت قائم نہیں ہوگی، عوام کا اعتماد بحال نہیں ہوسکتا۔

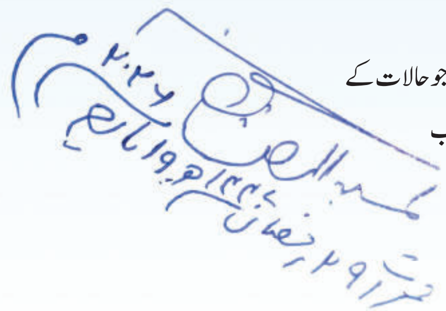

مایوسی ایک قید خانہ ہے جس کی دیواریں ہمارے اپنے خوف اور بے بسی نے کھڑی کی ہیں۔ تاریخ ان قوموں کو یاد نہیں رکھتی جو حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہیں، بلکہ انہیں یاد رکھتی ہے جو طوفانوں کا رخ موڑنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ "مایوسی کیوں؟" کا جواب ہمیں اپنی کمزوریوں کے ادراک اور ان کو دور کرنے کے پختہ عزم میں تلاش کرنا ہوگا۔ راستہ مشکل ضرور ہے، مگر ناممکن نہیں۔ ہمیں صرف اس سڑک پر چلتے رہنا ہے؛ موڑ آئیں گے، مگر راستہ بند نہیں ملے گا۔ ان شاءاللہ!

فہمِ قرآن

الانعام 130-135

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ شَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ 130

ترجمہ: اے جنات اور انسانوں کے گروہ! کیا تمھارے پاس خود تم میں سے وہ پیغمبر نہیں آئے تھے جو تمھیں میری آیتیں پڑھ کر سناتے تھے اور تم کو اسی دن کا سامنا کرنے سے خبر دار کرتے تھے جو آج تمھارے سامنے ہے؟ وہ کہیں گے: (آج) ہم نے خود اپنے خلاف گواہی دے دی ہے (کہ واقعی ہمارے پاس پیغمبر آئے تھے اور ہم نے انھیں جھٹلایا تھا) اور (درحقیقت) ان کو دنیوی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا تھا اور (اب) انھوں نے خود اپنے خلاف گواہی دے دی کہ وہ کافر تھے۔ 130

تشریح نمبر 1: انسانوں میں تو پیغمبروں کا تشریف لانا واضح ہے۔ اس آیت کی وجہ سے بعض علما کا کہنا ہے کہ جنّات میں بھی آنحضرت ﷺ سے پہلے پیغمبر آتے رہے ہیں اور دوسرے حضرات کا کہنا یہ ہے کہ باقاعدہ پیغمبر تو جنّات میں نہیں آئے، لیکن انسانوں میں جو پیغمبر بھیجے گئے، وہی جنّات کو بھی تبلیغ کرتے تھے اور جو جنّات مسلمان ہو جاتے وہ پھر انبیائے کرام کے نمائندے بن کر دوسرے جنّات کو تبلیغ کرتے تھے، جیسا کہ سورۂ جن میں تفصیل سے مذکور ہے۔ آیت کی رو سے دونوں احتمال ممکن ہیں، کیوں کہ آیت کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں اور جنّات دونوں کو تبلیغ کا حق ادا کر دیا گیا تھا اور وہ دونوں طرح ممکن ہے۔

تشریح نمبر 2: پیچھے آیت نمبر 23 میں گزرا ہے کہ وہ شروع میں جھوٹ بولنے کی کوشش کریں گے، لیکن جب خود ان کے ہاتھ پاؤں اُن کے خلاف گواہی دے دیں گے تو وہ بھی سچ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ 131

ترجمہ: یہ (پیغمبر بھیجنے کا) سارا سلسلہ اس لیے تھا کہ تمھارے پروردگار کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ بستیوں کو کسی زیادتی کی وجہ سے اس حالت میں ہلاک کر دے کہ اس کے لوگ بے خبر ہوں۔ 131

تشریح نمبر 3: اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان بستی والوں کی کسی زیادتی کی وجہ سے اُن کو ہلاک کرنا اللہ تعالیٰ کو اُس وقت تک گوارا نہیں تھا، جب تک انھیں انبیائے کرام علیہم السّلام کے ذریعے متوجہ نہ کر دیا جائے اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود یہ زیادتی نہیں کر سکتا تھا کہ پہلے سے متوجہ کیے بغیر لوگوں کو ہلاک کر دے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ 132

ترجمہ: اور ہر قسم کے لوگوں کو مختلف درجات ان اعمال کے حساب سے ملتے ہیں جو انھوں نے کیے ہوتے ہیں اور جو اعمال بھی وہ کرتے ہیں، تمھارا پروردگار اُن سے غافل نہیں ہے۔ 132

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ إِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَا اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ 133

ترجمہ: اور تمھارا پروردگار ایسا بے نیاز ہے جو رحمت والا بھی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم سب کو (دنیا سے) اُٹھا لے اور تمھارے بعد کسی اور قوم کو تمھاری جگہ لے آئے، جیسے اُس نے تم کو کچھ اور لوگوں کی نسل سے پیدا کیا تھا۔ 133

تشریح نمبر 4: یعنی اُس نے رسولوں کو بھیجنے کا جو سلسلہ جاری فرمایا اُس کی وجہ معاذ اللہ یہ نہیں تھی کہ وہ تمھاری عبادت کا محتاج ہے، وہ تو مخلوق کی عبادت سے بے نیاز ہے، لیکن اس کے ساتھ وہ رحمت والا بھی ہے، اس لیے اُس نے پیغمبر بھیجے ہیں جو بندوں کو اُس صحیح راہِ عمل کی طرف متوجہ کرتے رہیں، جس میں اُن کی دُنیا اور آخرت دونوں کے لیے بہتری کا سامان ہو۔

تشریح نمبر 5: جس طرح آج کے تمام لوگ اُن لوگوں کی نسل سے ہیں جن کا اب کوئی پتہ نشان باقی نہیں رہا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کو یہ بھی قدرت ہے کہ آج کے تمام لوگوں کو ایک ہی مرتبہ میں ختم کر کے دوسری قوم پیدا کر دے، لیکن وہ اپنی رحمت کی وجہ سے ایسا نہیں کر رہا۔

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ 134

ترجمہ: یقین رکھو کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے، اُس کو آنا ہی آنا ہے اور تم (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے۔ 134

تشریح نمبر 6: اس سے مراد آخرت اور جنت اور جہنم ہے۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ 135

ترجمہ: (اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہو کہ اے میری قوم! تم اپنی جگہ (اپنے طریقے کے مطابق) عمل کرو، میں (اپنے طریقے کے مطابق) عمل کر رہا ہوں، پھر جلد ہی تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ اس دُنیا کا انجام کس کے حق میں نکلتا ہے۔ یہ حقیقت (اپنی جگہ) ہے کہ ظالم لوگ فلاح نہیں پاتے۔

مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

فہم حدیث

سجدہ کی فضیلت

عَنْ مَعْدَانِ بْنِ طَلْحَةَ قَالَ لَقِيْتُ ثَوْبَانَ مَوْلٰى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقُلْتُ أَخْبِرْنِىْ بِعَمَلٍ أَعْمَلُهُ يُدْخِلُنِي اللّٰهُ بِهِ الْجَنَّةَ فَسَكَتَ ثُمَّ سَأَلْتُهُ فَسَكَتَ ثُمَّ سَأَلْتُهُ الثَّالِثَةَ فَقَالَ سَأَلْتُ عَنْ ذٰلِكَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ عَلَيْكَ بِكَثْرَةِ السُّجُودِ لِلّٰهِ فَإِنَّكَ لَا تَسْجُدُ لِلّٰهِ سَجْدَةً إِلَّا رَفَعَكَ اللّٰهُ بِهَا دَرَجَةً وَحَطَّ بِهَا عَنْكَ خَطِيْئَةً قَالَ مَعْدَانُ ثُمَّ لَقِيْتُ أَبَا الدَّرْدَاءِ فَسَأَلْتُهُ فَقَالَ لِيْ مِثْلَ مَا قَالَ ثَوْبَانُ (رواہ مسلم)

ترجمہ: معدان بن طلحہ تابعی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام اور خادمِ خاص حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے عرض کیا کہ "مجھے کوئی ایسا عمل بتائیے، جس کے کرنے سے اللہ تعالیٰ مجھے جنّت عطا فرمادے!" انھوں نے خاموشی اختیار فرمائی اور میری اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے دوبارہ وہی سوال کیا، انھوں نے اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں دیا اور سکوت اختیار فرمایا۔ اس کے بعد تیسری مرتبہ میں نے پھر وہی سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہی سوال میں نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ "تم اللہ کے حضور میں سجدے زیادہ کیا کرو، جو سجدہ بھی تم اللہ کے لیے کروگے، اس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ تمہارا درجہ ضرور بلند کرے گا اور تمہارا کوئی نہ کوئی گناہ اس کی وجہ سے ضرور معاف ہوگا۔" معدان کہتے ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے دوسرے صحابی حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضری کا مجھے موقع ملا تو ان سے بھی میں نے یہی سوال کیا تو انھوں نے بالکل وہی بتایا جو حضرت ثوبان نے فرمایا تھا۔ (صحیح مسلم)

قومہ اور جلسہ

رکوع اور سجدے کے درمیان قومہ کا حکم ہے اور اسی طرح ایک رکعت کے دو سجدوں کے درمیان جلسہ مشروع ہے۔ ان دونوں کے بارے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت اور آپ کا معمول یہ تھا۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا قَالَ الْإِمَامُ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ فَقُوْلُوا اللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ فَإِنَّهُ مَنْ وَافَقَ قَوْلُهُ قَوْلَ الْمَلٰئِكَةِ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ (رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب امام (رکوع سے اٹھتے ہوئے) کہے سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ (اللہ نے سنی اس بندہ کی جس نے اس کی حمد کی) تو تم (مقتدی لوگ) کہو: اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ (اے اللہ! ہمارے پروردگار تیرے ہی لیے ساری حمد و ستائش ہے) تو جس کا کہنا ملائکہ کے کہنے کے موافق ہوگا، اس کے پچھلے سارے گناہ معاف کردیے جائیں گے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح: نماز باجماعت میں جب امام رکوع سے اٹھتے ہوئے سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ کہتا ہے تو اللہ کے فرشتے بھی اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کہتے ہیں۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے امام کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کو حکم دیا ہے کہ اس موقع پر وہ بھی یہی کلمہ کہا کریں اور فرمایا ہے کہ جن لوگوں کا یہ کلمہ فرشتوں کے کلمہ کے موافق اور مطابق ہوگا، اس کلمہ کی برکت سے ان کے پچھلے قصور معاف ہوجائیں گے۔ موافق اور مطابق ہونے کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ بالکل ان کے ساتھ ہو آگے پیچھے نہ ہو۔ واللہ اعلم

عَنْ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ قَالَ كُنَّا نُصَلِّىْ وَرَاءَ النَّبِيِّ ﷺ فَلَمَّا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرَّكْعَةِ قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ فَقَالَ رَجُلٌ وَرَاءَهُ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ مَنِ الْمُتَكَلِّمُ اٰنِفًا قَالَ أَنَا قَالَ رَأَيْتُ بِضْعَةً وَ ثَلٰثِيْنَ مَلَكًا يَبْتَدِرُوْنَهَا أَيُّهُمْ يَكْتُبُهَا أَوَّلًا (رواہ البخاري)

ترجمہ: حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے، جب آپ نے رکوع سے سر اٹھایا اور کہا: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ تو آپ کے پیچھے مقتدیوں میں سے ایک شخص نے کہا: رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ اے ہمارے رب! آپ ہی کے لیے ہی ساری حمد، بہت زیادہ حمد، بہت پاکیزہ اور مبارک حمد! جب رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے دریافت فرمایا: "اس وقت یہ کہنے والا کون تھا؟" اس شخص نے کہا کہ "میں نے کہا تھا۔" آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے تیس سے کچھ اوپر فرشتوں کو دیکھا کہ وہ باہم مسابقت کر رہے تھے کہ کون اس کو پہلے لکھے گا۔ (صحیح بخاری)

تشریح: حدیث میں اس کلمہ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيْرًا کے لکھنے کے لیے تیس سے زیادہ فرشتوں کی، جس مسابقت کا ذکر ہے، اس کا خاص سبب غالبًا اس بندہ کے دل کی وہ خاص کیفیت تھی، جس کیفیت سے اس نے اللہ کی حمد کا یہ مبارک کلمہ کہا تھا۔

Shangrila
THE FOOD EXPERTS!
Shangrila
THE FOOD EXPERTS!
GARLIC CHILLI SAUCE
GARLIC CHILLI
TOU MUST HAI!

حضرت مولانا عبدالستار حفظہ اللہ

امت کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو وصیتیں

ہم زندگی کے کتنے ہی وسائل کیوں نہ اکٹھے کر لیں، اسباب جمع کر لیں ان سے زندگی کا سامان تو اچھا ہو جائے گا، لیکن زندگی کی کوالٹی اچھی نہیں ہو سکتی۔ پیسے اور فیکٹری اور کارخانے، ملازمت اور ڈگریاں، اس سے گھروں کی چیزیں تو بڑھ سکتی ہیں زندگی کا سامان تو بڑھ سکتا ہے۔ پچھلے 30،40 سالوں میں یہ سامان بڑھا بھی ہے؛ غریب کا سامان بھی بڑھا ہے اور امیر کی دولت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ہر شخص کی زندگی میں ساز و سامان تو بڑھا ہے، اس لیے کہ پیسہ جو بڑھا، لیکن سچی بات ہے زندگی کی کوالٹی گر گئی ہے۔

ایسا نہیں کہ راحت کی چیزیں بڑھی ہوں تو راحت بھی بڑھ گئی ہو، سکون کے نقشے اچھے ہو گئے ہوں تو سکون بھی بہت اچھا ہو گیا ہو، گھروں میں تحفے تحائف بہت قیمتی آ گئے ہوں تو محبتیں بھی بڑھ گئی ہوں، بازاروں کا ساز و سامان بہت بڑھیا ہو گیا ہو تو وہاں سچائی اور دیانت بھی آ گئی ہو، وہاں کی عمارتیں بلند و بالا بن گئیں تو وہاں خیر خواہی اور انسانیت بھی ہری بھری ہو گئی ہو۔ ایسا بالکل نہیں ہوا! پیسہ آیا، چیزیں ضرور بڑھیں، مگر زندگی کی کوالٹی گر گئی، زندگی کا معیار گرتا چلا گیا۔ اس کے لیے اللہ کا دین اور اس سچائی کے پیچھے اللہ کی ذات، اللہ کا قرآن، اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی گواہ ہے کہ اگر زندگی کی کوالٹی اچھی کرنا چاہتے ہو تو پھر اپنی زندگی میں دین لانا ہوگا۔

ہماری مثال اس بوڑھے کی طرح ہے جو گلی میں ہیرا تلاش کر رہا ہے اور جب بہت دیر ہوئی ہیرا تلاش کرتے کرتے تو نوجوان نے پوچھ لیا: ”بڑے میاں! کیا گم ہوا ہے؟“ کہا: ”ہیرا گم ہوا ہے۔“ وہ بھی تلاش کرنے لگا۔ جب بہت دیر ہوئی تو نوجوان نے پوچھا: ”بڑے میاں! ہیرا گم کہاں ہوا ہے؟“ بڑے میاں کہنے لگے: ”گم تو گھر میں ہوا ہے، لیکن وہاں اندھیرا بہت ہے، یہاں باہر تلاش کر رہا ہوں، کیوں کہ یہاں روشنی بہت ہے۔“ یہی کہیں گے کہ بڑے میاں کی عمر کا تقاضا ہوگا، عقل سٹھیا گئی ہوگی، دماغ کمزور ہو چکا ہوگا، اس لیے یہ فلسفہ پیش کر رہے ہیں کہ گم تو اندر ہوا ہے۔۔۔ مگر اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہاں نہیں بلکہ باہر جہاں روشنی ہے وہاں تلاش کر رہا ہوں۔

آج دنیا کے اسٹیج پر یہی کھیل دکھایا جا رہا ہے۔ دنیا کا مزہ تو انسان کے اندر گم ہے اور یہ نادان انسان اسے باہر کے نقشوں میں تلاش کر رہا ہے۔ اسے وہاں کچھ نہیں ملنا، لیکن کیا کرے؟ اندر جھانکتا ہے تو اندھیرا بہت ہے، باہر چمک دمک بہت ہے، اس کی تلاش میں دوڑ لگا رہا ہے، لیکن زندگی کے سکون اور مزے سے دور دور جا رہا ہے۔ بڑے میاں ساری زندگی ہیرا ڈھونڈتے رہتے، تب بھی نہ ملتا۔ یہ نادان انسان ساری زندگی بھی دوڑتا رہے اسے زندگی کا لطف نہیں ملنا؛ جہاں چیز گم ہوئی ہے وہیں ملے گی، لیکن کیا کرے وہاں اندھیرا بہت ہے۔

بڑے میاں کی تو عقل سٹھیا گئی ہوگی، مگر دنیا ہمارے بارے میں کہے گی کہ ان کا علم غلط ہو گیا ہے۔ ان کی معلومات غلط ہو گئی ہیں۔ ان کی معلومات کے سرچشمے غلط ہو گئے ہیں۔ ان کی معلومات کے ماخذ اور بنیادیں غلط ہو گئی ہیں۔ انھوں نے کبھی قرآن سے علم حاصل نہیں کیا، انھوں نے کبھی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی سے رہنمائی نہیں لی، انھوں نے کبھی اسلام اور ہدایت کی روشنی سے اپنی زندگی کے مسائل حل نہیں کیے۔ ان نادانوں کا علم غلط ہو گیا، ان کے اس غلط علم نے انھیں یہ سبق پڑھایا کہ پیسہ بڑھیا، دولت بڑی، اسٹیٹس اچھا، آمدنی اچھی اور روزگار بڑھیا ہو تو زندگی اچھی ہو جائے گی۔

یورپ و مغرب جہاں دولت کی ریل پیل ہے، خودکشیوں کا بھی پہلے نمبر ہے۔ ہر دوسری عورت کو طلاق ہے اور بوڑھے ماں باپ کے لیے گھر میں جگہ نہیں، اس لیے انھیں ”اولڈ ایج ہوم“ میں رکھتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ بیٹے کے پاس پاؤنڈ نہیں یا بیٹی کے پاس ڈالر نہیں، بلکہ ان بدقسمت لوگوں کے پاس وہ دل نہیں ہے، جس میں ماں باپ کی عظمت اور محبت ہوا کرتی ہے، وہ دولت نہیں ہے۔۔۔ اور ہم اسی ریس میں نکل کھڑے ہوئے ہیں، اس لیے کہ ہمارا علم بھی غلط ہو گیا ہے۔

اگر زندگی کا لطف چاہیے، زندگی کا سکون چاہیے اور زندگی کی کوالٹی اچھی کرنی ہے تو پھر زندگی میں دین بڑھیا لانا ہوگا۔ یہ ستّر اسّی سالہ زندگی کا سرمایہ بھی ہے اور جہاں ہمارے ابّا، امّاں، دادا، پردادا اور خاندان کے کئی لوگ شفٹ ہو گئے، اس شفٹنگ کا سرمایہ بھی یہی ہے۔ اب اگر یہ سرمایہ ہاتھ میں نہ ہوا تو وَالْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ (اور فرشتے ان کے چہروں اور پیٹھوں پر ضربیں لگا رہے ہوں گے)۔ یہ دنیا سے جا رہے ہوں گے اور اللہ کے فرشتے ان کے چہرے اور پیٹھ پر ان کی پٹائی کر رہے ہوں گے۔ یہ اللہ کا کلام ہے، یہ اللہ کے کلام کا پیغام ہے۔ اللہ کی رحمت و شفقت ہے کہ وقت سے پہلے آگاہ کر دیا۔

دوسری طرف کچھ لوگ ہوں گے جو یہاں سے پچاس ساٹھ سال زندگی گزار کر دنیا سے شفٹ ہو رہے ہوں گے اور فرشتے ان کا استقبال کر رہے ہوں گے: اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا

وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ (نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کی خوشخبری لو)۔ اللہ کے فرشتے انھیں حوصلہ دے رہے ہوں گے، ان کی ہمت بڑھا رہے ہوں گے، انھیں خوشخبریاں دے رہے ہوں گے کہ اگلی زندگی اس سے بڑھیا ہے، آگے کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے ہزاروں لاکھوں گنا بڑھیا ہیں اور ان کا معیار شاندار ہے۔ دونوں قسم کے لوگ یہاں سے شفٹ ہوں گے۔

کچھ نہیں کام آنا! نہ یہ زندگی کے نقشے میری زندگی کی کوالٹی اچھی کر سکتے ہیں اور نہ میری موت اچھی کر سکتے ہیں۔ ہاں! اگر ایمان ہے تو پھر دنیا بھی نعمت ہے۔ مال بھی اللہ کی نعمت ہے۔ صحت بھی اللہ کی نعمت ہے۔ دولت بھی اللہ کی نعمت ہے اور معاشرے میں اچھی عزت بھی اللہ کی نعمت ہے۔ ورنہ اللہ کی نافرمانی کے ساتھ رہنا، اللہ کی نافرمانی کے ساتھ دنیا میں عزت تلاش کرنا اور اللہ کو ناراض کر کے دولت اور پیسہ اکٹھا کرنا، اپنے لیے موت اور ہلاکت اکٹھی کرنا ہے۔

ہم اپنے بچوں اور بچیوں میں خوشیاں دیکھنا چاہتے ہیں اور اپنی زندگیوں میں سکون دیکھنا چاہتے ہیں تو انھیں دین کی دولت سے محروم نہ ہونے دیں، انھیں دین کے سرمائے سے محروم نہ ہونے دیں، کچھ نہیں بچے گا۔ آج ہم اپنی نجی زندگی میں، اپنی گھریلو زندگی میں، اپنی ذاتی زندگی میں اور اپنے معاشرے اور قومی سطح پر جن مصائب اور مسائل سے دوچار ہیں، اگر اس کی ایک ہی بات عرض کی جائے تو وہ یہ ہے کہ ہم دین اسلام سے بہت دور جا نکلے ہیں۔

78 سال ہو گئے ہم نے اپنی قوم کو دینی تصوّر دیا نہ قومی شعور دیا اور آج اس کا عذاب نظر آ رہا ہے، اس کی مصیبتیں نظر آ رہی ہیں، اس کے مسائل ہر آدمی سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اتنا عرصہ قومی سطح پر اپنی قوم کو دین سے دور رکھنے کی سازش کی اور ہر وہ فکر اختیار کی، جس سے بے دینی بڑھے۔ ہر بے دین کو، ہر لادین کو اور ہر گناہ کے دلدادہ کو ہم نے معاشرے میں عزت دی، انھیں آگے بڑھایا اور مضبوط کیا۔ جنہوں نے اس قوم کو تقسیم کیا، نفرتوں میں ڈالا، بے حیا اور بدکار بنایا، عریانی پھیلائی اور معاشرے کے اندر حرام کو عام کیا، ان کو ہمارے معاشرے میں عزت ملی۔ آج اس کی تپش ہر گھر میں، ہر خاندان میں اور قومی سطح پر محسوس ہو رہی ہے، اس کی ہلاکتیں سامنے ہیں۔

اگر پورے اسلام کی تعریف ایک لفظ میں کی جائے تو اسلام نام ہے عدل کا۔ ہر شخص کے حقوق کا تحفظ عدل میں ہے، اسلام کے عدل میں ہے۔ عورت کا بھی، مرد کا بھی، غریب کا بھی؛ معاشرے اور سوسائٹی کے ہر فرد کے حقوق کا علمبردار اسلام ہے۔ وطنیت نہیں، قومیت نہیں، لسانیت نہیں، زبان کی بنیاد پر نہیں، گروہ بندیاں نہیں، ان چیزوں سے حقوق نہیں ملا کرتے۔ اس سے نفرتیں عام ہوتی ہیں، مسلمانوں میں تقسیم ہوتی ہے، معاشرے اور سوسائٹی کے اندر تخریب کاری ہوتی ہے۔ حقوق اسلام دیتا ہے، اسلام ہر ایک کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے سے خطبا سے یہ کہا گیا کہ ہر جمعہ میں یہ آیت پڑھا کرو۔ اللہ تعالیٰ انصاف کی بات کرتا ہے، انصاف کی تلقین کرتا ہے، تمھیں انصاف کا حکم دیتا ہے۔ ہر جمعے میں اس لیے پڑھی جاتی ہے کہ پورے اسلام کو ایک لفظ میں تعبیر کریں تو اسلام نام ہی عدل کا ہے۔ اللہ کے حق میں انصاف، مخلوق کے حق میں انصاف۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: ”میری خوش نصیبی، میری خوش قسمتی، میری سعادت کہ حضور ﷺ دنیا سے جا رہے ہیں، لیکن میری گود میں آرام فرما رہے ہیں، آپ ﷺ کا سر میری گود میں ہے۔“ اور میری خوش نصیبی ہے کہ جو چیز آپ ﷺ کے منہ میں اور آپ ﷺ کے پیٹ میں سب سے آخر میں گئی وہ میرا لعاب تھا۔ میں نے مسواک چبائی، اللہ کے نبی ﷺ کی چاہت تھی کہ مسواک مل جائے تو اللہ کے نبی ﷺ نے اسے اپنے منہ میں رکھ لیا۔ سب سے آخری خوراک اور چیز جو آپ ﷺ کے پیٹ میں گئی وہ میرا لعاب تھا اور میری خوش قسمتی کہ میری گود میں آپ ﷺ کا سر رکھا ہوا تھا۔

آپ ﷺ کے لب ہل رہے تھے، میں نے کان قریب کیے، محسوس کرنا چاہا کہ آپ ﷺ کیا فرما رہے ہیں۔ اس آخری گھڑی میں آپ ﷺ امت کو کیا پیغام دینا چاہ رہے ہیں؟ میں نے جب کان قریب کیے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اَلصَّلٰوةَ الصَّلٰوةَ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (نماز، نماز اور جو تمہارے ماتحت ہیں ان کا خیال رکھنا) گویا کہ آپ ﷺ کی پوری عدل و انصاف کی زندگی کا خلاصہ، آپ ﷺ کی پوری اسلامی زندگی کا خلاصہ بلکہ ساری زندگی جس کی آپ ﷺ نے تبلیغ اور دعوت چلائی اس کا خلاصہ جاتے جاتے اپنی امت کو دے رہے ہیں اور فرما رہے ہیں: ”نماز کا اہتمام۔“ یہ اللہ کے حقوق میں سب سے بڑا حق ہے۔ ایمان کے بعد، مسلمان ہونے کے بعد اللہ کے حقوق میں سب سے بڑا حق نماز ہے۔

اور مخلوق کے حق میں فرمایا جو کم زور طبقہ ہے، جو تمہارے ماتحت ہے، اس کے حق میں بھی خیانت نہ کرنا، اس کے حق میں بھی کوتاہی نہ کرنا، اس کے معاملے میں بھی ناانصافی نہ کرنا۔ طاقت ور تو اپنا حق لے لیا کرتا ہے، مگر مخلوق کے حق میں جو کم زور طبقہ ہے، جو تمہارے ماتحت ہے، جس کے پاس وسائل نہیں اپنا حق لینے کے، اس کے معاملے میں اللہ سے ڈرنا۔

کچھ بھی ہو جائے۔۔۔ ہم زندگی کے کسی بھی مشغلے میں ہوں اور دنیا کے کسی کونے میں ہوں، سفر میں ہوں، حضر میں ہوں، قید میں ہوں، بیماری میں ہوں، کہیں بھی ہوں، نماز نہیں چھوڑنی۔ اپنے نبی ﷺ کی زندگی کی آخری نصیحت کی لاج رکھنی ہے، بہت کچھ مل جائے گا۔ نبی ﷺ کی شفاعت سے محروم نہیں ہوں گے، نبی ﷺ کے ہاتھوں سے حوضِ کوثر کا پانی پینے سے محروم نہیں ہوں گے۔

اپنی اولاد کو بھی دین پر لائیں، دنیا کے کسی کونے میں ہوں نماز نہیں چھوڑنی۔ سفر میں ہیں، حضر میں ہیں، فلائٹ پر ہیں، گاڑی میں ہیں، بستر پر ہیں؛ اسلام نے زندگی میں نماز کی معافی نہیں رکھی، آسانی رکھی ہے۔ سفر میں کم کر سکتے ہو، مختصر کر سکتے ہو؛ تم بستر پر اشارے سے پڑھ سکتے ہو، تیمم کر سکتے ہو، بغیر پانی کے تمہاری نماز ہو سکتی ہے، بغیر کھڑے تمہاری نماز ہو سکتی ہے، بغیر بیٹھے تمہاری نماز ہو سکتی ہے، لیکن جب تک تم مسلمان ہو تم نماز نہیں چھوڑ سکتے۔ کافر نماز چھوڑتا ہے، مشرک نماز چھوڑتا ہے؛ ہندو، عیسائی، سکھ اور لامذہب نماز نہیں پڑھتے، مگر مسلمان چاہے کالج میں ہے، یونیورسٹی میں ہے، کہیں بھی ہے، بازار اور دفتر میں ہے، مسلمان نماز نہیں چھوڑتا۔

دوسری چیز آپ ﷺ نے دنیا سے جاتے ہوئے فرمائی کہ اللہ کے بندوں کے حقوق ضائع نہ کرنا، اللہ کی مخلوق کے ساتھ ناانصافی نہ کرنا۔ تمہاری ذات سے کسی کے ساتھ ظلم نہ ہو؛ نہ مالی، نہ جسمانی اور نہ زبانی۔ تمہاری ذات سے کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو، انصاف کی زندگی لے کر جاؤ اور اگر دن میں کوئی کوتاہی ہو گئی ہو تو رات سونے سے پہلے روزانہ سچے دل سے اللہ سے معافی مانگ لو۔ اگر ان تین چیزوں کو اپنی زندگی کا معمول بنا لو تو ان شاء اللہ اسلام کی زندگی میں ترقی ہو گی، ایمان کی زندگی میں ترقی ہو گی اور پھر کیا ہو گا؟ دنیا کا جینا بھی پُرلطف ہو گا اور دنیا سے جانا اس دنیا میں رہنے سے زیادہ خوب صورت ہو گا۔

حرمتِ ذوالقعدة

ریما نور رضوان

غیر معمولی اہمیت کا حامل مہینہ

ذوالقعدہ کا مہینہ اسلامی تقویم کا ایک نہایت باعظمت، بابرکت اور روحانی حیثیت رکھنے والا مہینہ ہے۔ یہ وہ مقدّس مہینہ ہے جو صرف ایک تاریخ نہیں بلکہ اپنے اندر عقیدت، احترام، امن، عبادت، صبر اور روحانی تربیت کا مکمل نظام سموئے ہوئے ہے۔ شرعی اعتبار سے ذوالقعدہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ یہ ان چار مہینوں میں شامل ہے جنہیں اشہرِ حرم یعنی حرمت والے مہینے کہا جاتا ہے۔ ان مہینوں کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے خصوصی تقدّس عطا فرمایا ہے اور ان میں گناہوں سے بچنے، عبادت بڑھانے اور نیکیوں میں سبقت لے جانے کی خاص تاکید فرمائی ہے۔

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"بے شک مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ ہے، ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔" (التوبہ)

یہ چار مہینے ہیں: 1۔ذوالقعدہ 2۔ذوالحجہ 3۔محرم 4۔رجب

ذوالقعدہ ان میں پہلا مہینہ ہے، جو روحانی تیاری، عبادت کے ذوق اور حج کے عظیم فریضے کی تمہید کا مہینہ بھی ہے۔

ذوالقعدہ حرمت اور امن کا مہینہ ذوالقعدہ کے لفظی معنی "رک جانے" کے ہیں، یعنی لڑائی جھگڑے، فتنہ و فساد اور جنگ و جدال سے رُک جانے کا مہینہ۔۔۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی عرب اس مہینے کا احترام کرتے تھے۔ اس میں جنگیں روک دی جاتی تھیں، تاکہ لوگ امن کے ساتھ سفر کر سکیں، تجارت کر سکیں اور عبادت کے لیے تیاری کر سکیں۔ اسلام نے اس حرمت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے شرعی بنیاد عطا کی۔ شرعی اعتبار سے اس مہینے میں ظلم زیادہ سنگین گناہ بن جاتا ہے۔ گناہ کی نحوست بڑھ جاتی ہے۔ نیکی کا اجر کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ عبادت کی تاثیر زیادہ ہو جاتی ہے۔ یہ مہینہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ امن صرف معاشرتی نظام کا نام نہیں بلکہ روحانی تربیت کا بھی نام ہے۔ انسان کا دل بھی فساد سے پاک ہو، زبان بھی فساد سے محفوظ ہو اور کردار بھی فساد سے پاک ہو، یہی ذوالقعدہ کا اصل پیغام ہے۔

حج کی تیاری کا مہینہ: ذوالقعدہ حج کے عظیم فریضے کا پہلا دروازہ ہے۔ حج کے مہینے شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ ہیں۔ یعنی ذوالقعدہ پورا مہینہ حج کی تیاری کا مہینہ ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب نیتیں بنتی ہیں، دل اللہ کے گھر کی طرف مائل ہوتے ہیں اور روحانی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

گناہوں سے توبہ کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ دنیا سے دل کم اور آخرت سے دل زیادہ جڑنے لگتا ہے۔

شرعی لحاظ سے ذوالقعدہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ عبادت صرف عمل کا نام نہیں بلکہ تیاری، نیت، سوچ اور باطن کی اصلاح کا بھی نام ہے۔

نیکیوں میں اضافے کا موقع: اگرچہ ذوالقعدہ کے مہینے میں مخصوص عبادات فرض کے طور پر مقرر نہیں، لیکن اس کی حرمت کی وجہ سے ہر نیکی کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔

مثلاً نمازوں کی پابندی، نوافل کا اہتمام،

قرآن کی تلاوت، ذکر و اذکار درود شریف، صدقہ و خیرات، صلہ رحمی

دلوں کی صفائی معافی مانگنا اور معاف کرنا یہ سب اعمال

ذوالقعدہ میں خاص روحانی تاثیر رکھتے ہیں۔ یہ مہینہ ہمیں تعداد نہیں بلکہ قدر کی طرف لے جاتا ہے، یعنی عبادت زیادہ نہیں، خالص ہو۔

گناہوں سے بچنے کی خاص تاکید: شرعی نقطۂ نظر سے ذوالقعدہ میں گناہ سے بچنا عام دنوں سے زیادہ ضروری ہے، کیونکہ حرمت والے مہینوں میں گناہ کی سنگینی بڑھ جاتی ہے۔

یہاں ایک اہم روحانی نکتہ ہے، اگر نیکی کا اجر بڑھ جاتا ہے تو گناہ کی نحوست بھی بڑھ جاتی ہے۔

لہٰذا زبان کی حفاظت، نظر کی حفاظت، دل کی حفاظت، نیت کی حفاظت، معاملات کی صفائی۔۔۔ یہ سب ذوالقعدہ کا بنیادی پیغام ہیں۔

روحانی تربیت کا مہینہ: ذوالقعدہ صرف عبادات کا نہیں بلکہ تزکیۂ نفس (نفس کی اصلاح) کا مہینہ ہے۔ یہ مہینہ ہمیں سکھاتا ہے کہ خاموشی بھی عبادت ہو سکتی ہے۔

برداشت بھی عبادت ہے، صبر بھی عبادت ہے، معاف کرنا بھی عبادت ہے، خود احتسابی بھی عبادت ہے۔

یہ مہینہ ہمیں شور سے سکون، جلد بازی سے ٹھہراؤ اور نفس پرستی سے اللہ پرستی کی طرف لے جاتا ہے۔

معاشرتی اہمیت: شرعی اعتبار سے ذوالقعدہ صرف فرد کی اصلاح نہیں بلکہ معاشرے کی اصلاح کا مہینہ بھی ہے۔

یہ ہمیں سکھاتا ہے لڑائی جھگڑے ختم کرو، رشتے جوڑو، دلوں کو صاف کرو، نفرتیں ختم کرو، الزام تراشی چھوڑو، بدگمانی سے بچو، حسد، کینہ اور بغض کو دل سے نکالو کیوں کہ ایک پاک معاشرہ ہی عبادت کے اثرات کو زندہ رکھتا ہے۔ آج کے دور میں ذوالقعدہ کا پیغام یہی ہے کہ ہم ایسے دور میں زندہ ہیں جہاں دل بے سکون ہیں، ذہن منتشر ہیں، روح کمزور ہے، تعلقات کھوکھلے ہیں، عبادت رسمی بن چکی ہے۔ ذوالقعدہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ سکون باہر نہیں، اندر ہوتا ہے۔ اصلاح دنیا میں نہیں، دل میں ہوتی ہے۔ امن قانون سے نہیں، کردار سے آتا ہے۔

یہ مہینہ ہمیں واپس اصل کی طرف بلاتا ہے، اللہ کی طرف، قرآن کی طرف، اخلاق کی طرف، حیا کی طرف، روحانیت کی طرف بلاتا ہے۔

ذوالقعدہ خاموش انقلاب کا مہینہ: یہ مہینہ شور نہیں مچاتا، نعرے نہیں لگاتا، مگر دل بدل دیتا ہے۔ یہ انقلاب باہر نہیں، اندر لاتا ہے۔ یہ تبدیلی نظام کی نہیں، انسان کی کرتا ہے۔

یہ مہینہ ہمیں سکھاتا ہے کہ اصل جہاد نفس کے خلاف ہے۔ اصل عبادت اخلاص ہے۔ اصل کام یابی رضائے الٰہی ہے اور اصل زندگی آخرت کی تیاری ہے۔

ذوالقعدہ کوئی عام مہینہ نہیں، یہ ایک روحانی مدرسہ ہے۔ ایک تربیتی مہینہ ہے، ایک اصلاحی دور ہے، ایک باطنی سفر ہے۔ شرعی اعتبار سے یہ مہینہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ عبادت صرف نماز روزے کا نام نہیں، دین صرف رسموں کا نام نہیں، تقویٰ صرف ظاہری لباس کا نام نہیں، اسلام صرف شناخت کا نام نہیں بلکہ یہ کردار، نیت، اخلاق، باطن اور تعلق باللہ کا نام ہے۔ ذوالقعدہ ہمیں خاموشی میں اللہ کو ڈھونڈنا سکھاتا ہے۔ سکون میں قربِ الٰہی محسوس کرنا سکھاتا ہے اور تیاری میں عبادت کی روح پیدا کرنا سکھاتا ہے۔ اگر ہم اس مہینے کو واقعی شرعی شعور کے ساتھ گزار لیں تو دل بدل سکتے ہیں، زندگیاں بدل سکتی ہیں، گھر بدل سکتے ہیں، معاشرے بدل سکتے ہیں اور سب سے بڑھ کر ہمارا انجام بدل سکتا ہے۔ یہی ذوالقعدہ کی اصل اہمیت ہے۔ یہی اس مہینے کا حقیقی پیغام ہے اور یہی اس کی شرعی روح ہے۔

خواتین اور ادب

حفصہ سلطان

ادب صرف لفظوں کا کھیل نہیں، بلکہ یہ ایک طاقت ور ذریعہ ہے جو معاشرے کے دل و دماغ کو بدل سکتا ہے اور جب یہ طاقت خواتین کے ہاتھوں میں آتی ہے تو یہ محض تخلیق کی بات نہیں رہتی، بلکہ سماجی شعور، اصلاح اور تبدیلی کی ایک قابلِ دید تحریک بن جاتی ہے۔ خواتین نے ہمیشہ قلم کے ذریعے دنیا کو اپنی نظر سے دیکھا، سوال اٹھایا اور اصلاح کی راہیں ہموار کیں۔

1۔ قلم اور شعور: خواتین کی شناخت خواتین نے ہر دور میں معاشرتی قدغنوں اور رکاوٹوں کے باوجود ادب کے ذریعے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ یہ ادب شاعری ہو، ناول، کہانی یا مضمون، سب خواتین کے دل کی آواز بن کر معاشرے تک پہنچا۔

دنیا بھر میں مختلف مصنّفین نے اپنے لکھنے کے ذریعے خواتین کی سماجی اور ذہنی آزادی کے حق میں آواز بلند کی۔ پاکستان میں بھی کئی ادیب خواتین نے نہ صرف خواتین کے جذبات بلکہ معاشرتی ناانصافیوں کو ادب میں زندہ کیا۔

ادب میں خواتین کی شمولیت اس لیے بھی اہم ہے کیوں کہ یہ معاشرے کے دوہرے معیار، صنفی تفریق اور سماجی رکاوٹوں کو سامنے لاتی ہے۔ ایک عورت کے قلم سے لکھی گئی کہانی میں چھوٹے سے چھوٹے جزوی احساس بھی وہ منظر دکھا سکتے ہیں جو معاشرے کے بڑے حصے سے چھپ جاتے ہیں۔

2۔ ادب کے ذریعے سماجی مسائل کی عکاسی خواتین کے قلم کی طاقت سب سے پہلے آواز بن کر معاشرتی مسائل کو اجاگر کرنے میں دکھائی دیتی ہے۔

تعلیم اور خود مختاری: کئی ادبی تخلیقات نے یہ دکھایا کہ تعلیم کی کمی یا سماجی پابندیاں کس طرح خواتین کی شخصیت اور سماجی کردار کو محدود کرتی ہیں۔

گھریلو تشدّد اور حقوق: کہانیوں اور شعروں میں خواتین نے گھریلو ناانصافی اور تشدّد کے مظاہر کو نمایاں کیا، جس سے معاشرہ سوچنے پر مجبور ہوا۔

ملازمت اور پیشہ ورانہ حدود: خواتین نے ادب کے ذریعے دکھایا کہ پیشہ ورانہ زندگی میں رکاوٹیں صرف مردانہ معاشرتی تصوّرات کا نتیجہ ہیں، نہ کہ قابلیت کا فقدان۔

3۔ ادب اور شعور کی تبدیلی خواتین کا ادب محض مسائل کی نشاندہی نہیں کرتا، بلکہ یہ معاشرتی شعور اور تبدیلی کی بنیاد بھی بنتا ہے۔

تربیتی اثر: کہانیاں اور مضامین نہ صرف عورت بلکہ معاشرے کے ہر فرد کو سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔

آئینہ سماج: ادب معاشرے کا عکس ہوتا ہے اور خواتین کے قلم سے یہ عکس وہ حقائق دکھاتا ہے جو اکثر چھپ جاتے ہیں۔

مستقبل کی نسل: خواتین کے لکھے ہوئے ادب سے نوجوان لڑکیاں اور لڑکے بھی متاثر ہوتے ہیں، اپنی سوچ اور رویّوں میں تبدیلی لاتے ہیں۔

4۔ ادب اور جدّت نئے زاویوں سے خواتین نے ادب میں جدّت اور تجربات کو بھی فروغ دیا۔

اردو ادب: جدید اردو میں خواتین نے اپنی منفرد آواز پیدا کی اور اس آواز نے معاشرتی نقائص کو بھی اجاگر کیا۔

جدید بلاگ اور آن لائن لکھائی: آج خواتین کے بلاگز، سوشل میڈیا پوسٹس اور ڈیجیٹل کہانیاں اسی سلسلے کا حصہ ہیں، جو نوجوانوں تک تیزی سے پہنچ رہی ہیں۔

شاعری میں تجربات: محبت، جدائی، عورت کا تنہائی میں فکری سفر اور معاشرتی جبر۔۔۔ یہ سب تجرباتی شاعری کے ذریعے واضح ہوئے۔

یہ تمام زاویے خواتین کے ادب کو محض تخلیق نہیں، بلکہ تبدیلی کا ہتھیار بناتے ہیں۔

5۔ ادب اور معاشرتی اصلاح ادب معاشرت میں اصلاح لانے کا سب سے نرم اور مؤثر ذریعہ ہے۔ خواتین کے قلم کے ذریعے یہ کام تین سطحوں پر ہوتا ہے:

شخصی سطح: خواتین خود اپنی شناخت، احساسات اور فکر کو بہتر سمجھتی ہیں۔

خاندانی سطح: کہانیاں اور شعری انداز خاندانی رویّوں کو متاثر کرتے ہیں اور گھر میں مثبت سوچ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

سماجی سطح: بلاگز، مضامین اور کتابیں معاشرے کو سوچنے، سوال کرنے اور عمل کرنے کی تحریک دیتی ہیں۔

مثال کے طور پر، خواتین کی لکھائی نے معاشرت میں تعلیم، صحت اور صنفی مساوات کے بارے میں نئے مکالمے پیدا کیے ہیں، جو صرف کلاس روم یا اجلاس میں ممکن نہیں۔

6۔ قلم کی طاقت اور ذمہ داری خواتین کے لیے ادب کے ذریعے سماجی تبدیلی کی طاقت ایک ذمہ داری بھی بن جاتی ہے۔ قلم کا ہر لفظ اثر رکھتا ہے اور خواتین کے لکھنے کا اثر معاشرتی رویّوں پر زیادہ دیر پا ہوتا ہے۔

حقائق کی درستی: لکھنے سے پہلے تحقیق اور تجزیہ ضروری ہے۔

اخلاص اور مقصد: ادب کا مقصد صرف دکھاوا یا شہرت نہیں، بلکہ معاشرتی بہتری ہونا چاہیے۔

تسلسل: ایک کتاب یا مضمون کافی نہیں، مستقل لکھائی اور اظہار کی ضرورت ہے۔

7۔ موجودہ دور میں خواتین کا کردار آج کے دور میں خواتین کا ادب صرف کتابوں یا رسائل تک محدود نہیں رہا۔

ڈیجیٹل دنیا: بلاگز، آن لائن جرنل اور سوشل میڈیا نے خواتین کو دنیا تک پہنچنے کا پلیٹ فارم دیا۔

عالمی سطح پر اثر: خواتین کے مضامین اور کہانیاں عالمی مسائل، ثقافت اور صنفی مساوات کے بارے میں گفتگو میں حصہ ڈال رہی ہیں۔

ثقافتی امتزاج: ادب کے ذریعے خواتین مختلف ثقافتوں، روایات اور تجربات کو ایک دوسرے سے جوڑ رہی ہیں، جس سے عالمی شعور پیدا ہوتا ہے۔

خواتین کے قلم میں نہ صرف تخلیقی صلاحیت ہے بلکہ یہ معاشرتی تبدیلی کا سب سے مؤثر ہتھیار بھی ہے۔ ہر کہانی، ہر شعر، ہر مضمون ایک چھوٹا بیج ہے جو سوچ، شعور اور عمل میں تبدیلی لا سکتا ہے۔ خواتین کے لکھنے کا مقصد محض اپنی آواز بلند کرنا نہیں، بلکہ معاشرت میں عدل، شعور اور احساسِ انسانیت پیدا کرنا بھی ہے، لہٰذا اگر معاشرے میں تبدیلی چاہیے تو خواتین کے قلم کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہر تحریر، ہر نظم اور ہر مضمون ایک انقلاب کی ابتدا ہو سکتی ہے، کیوں کہ الفاظ بھی عمل کی طرح اثر رکھتے ہیں۔

کیا ہم واقعی موحد ہیں؟

ڈاکٹر خنسا

اگر ہم سے کوئی پوچھے کہ کیا آپ موحّد ہیں تو شاید ہمیں سوال بُرا لگے۔ ہم فوراً یہی جواب دیں گے: ”الحمد للہ! کیوں نہیں! یہ کیسا سوال ہے؟“

لیکن اگر ذرا ٹھہر کر، سنجیدگی سے غور کیا جائے تو یہی سوال دل کے دروازے پر دستک دیتا ہے: ”کیا میں واقعی موحّد ہوں؟ کیا میں سچی توحید پر قائم ہوں؟“ ہم اکثر یہ سمجھتے ہیں کہ صرف اللہ کو مان لینا ہی کافی ہے۔ مگر تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی قومیں اللہ کے وجود کی منکر نہیں تھیں۔ ہندو مت میں بھی ایک اعلیٰ ہستی کا تصور موجود ہے۔ ان کی کتاب بھگوت گیتا میں خدا کے لیے مختلف نام ملتے ہیں اور وہ وشنو کو ایک اعلیٰ طاقت مانتے ہیں۔ رام اور کرشن کو اسی کے اوتار قرار دیا جاتا ہے۔ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا مختلف اوقات میں مختلف شکلوں میں زمین پر آتا ہے۔

اسی طرح بدھ مت میں بھی بڑے روحانی پیشواؤں کی تعظیم کی جاتی ہے۔ اگرچہ بنیادی تعلیمات مختلف ہیں، مگر وقت کے ساتھ مجسّموں کے سامنے جھکنا اور عقیدت کے اظہار کے مختلف طریقے عام ہو گئے۔

یہ کہنا درست نہیں کہ وہ اللہ کے منکر ہیں؛ وہ ایک اعلیٰ ہستی کو مانتے ہیں، مگر عبادت میں دوسروں کو شریک کر لیتے ہیں۔ وہ پتھروں کی پرستش محض پتھر سمجھ کر نہیں کرتے، بلکہ جب کسی پتھر کو کسی بزرگ یا دیوتا کی شکل دے دیتے ہیں تو اسے مقدّس سمجھنے لگتے ہیں۔

یہ سب دیکھ کر دل سوال کرتا ہے کہ اگر عبادت، نیاز، نذر اور دعائیں اللہ کے سوا کسی اور کے لیے ہوں تو پھر فرق کیا رہ جاتا ہے؟

ہم بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔۔۔ مگر یہ تو اللہ کا عطا کردہ انعام ہے کہ ہم مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا ہم توحید کی کسوٹی پر پورا اترتے ہیں؟

کیا ہماری عبادت خالصتاً اللہ کے لیے ہے؟

کیا ہماری اُمیدیں، خوف، دعائیں اور نذریں صرف اسی کے لیے ہیں؟

آج کل سوشل میڈیا، ڈراموں اور فلموں میں مزاروں اور قبروں کی عقیدت کو جس طرح romanticise کر کے پیش کیا جاتا ہے، وہ لمحۂ فکریہ ہے۔ لوگ مزارات پر جا کر نذریں چڑھاتے ہیں، دیگیں دیتے ہیں اور بعض اوقات ایسی دعائیں مانگتے ہیں جو صرف اللہ ہی سے مانگنی چاہییں۔

یہ سوچ کر دل کانپ اٹھتا ہے کہ کہیں ہم بھی تو لاعلمی یا روایت کے نام پر وہی غلطی تو نہیں دہرا رہے، جس سے ہمیں روکا گیا تھا؟

سچا موحّد وہ ہے جو صرف زبان سے نہیں بلکہ دل، نیت اور عمل سے بھی اللہ کو ایک مانے۔ جو یہ سمجھے کہ نفع و نقصان کا مالک صرف اللہ ہے۔ جو یہ یقین رکھے کہ سفارش، مدد اور فریاد کا اصل حق دار بھی وہی ہے۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم دوسروں پر انگلی اٹھانے سے پہلے خود سے یہ سوال کریں:

کیا میں واقعی موحّد ہوں؟

بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔۔۔

توحید صرف سجدے اور ظاہری عبادت کا نام نہیں، بلکہ دل کی گہرائیوں سے جڑی ہوئی حقیقت ہے۔ اسی سلسلے میں سورۂ بقرۃ کی آیت 165 کا پہلا حصہ ہمیں ایک نہایت باریک اور خوفناک حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے: ”اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہم سر بنا لیتے ہیں، ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہیے، جبکہ ایمان والے سب سے بڑھ کر اللہ ہی سے محبت کرتے ہیں۔“ (البقرۃ: 165)

یہ آیت شرک فی الحبّ کی طرف اشارہ کرتی ہے، یعنی محبت میں شرک۔

آپ سوچیں گے: محبت میں بھی شرک ہوتا ہے؟

جی ہاں۔ جب کسی کی محبت، کسی کی رضا، کسی کا خوف اور کسی کی ناراضی ہمارے دل میں اس درجے تک پہنچ جائے کہ ہم اللہ کے حکم کو پسِ پشت ڈال دیں تو یہی وہ مقام ہے، جہاں محبت عبادت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

”دل کے اندر چھپے بت“ ہمارے اندر بھی کئی بت ہوتے ہیں۔

وہ پتھر کے نہیں ہوتے، مگر اثر میں شاید اس سے بھی زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔

کسی کے دل میں ماں کا بت! کسی کے دل میں باپ کا! کسی کے دل میں محبوب یا شریکِ حیات کا! کسی کے دل میں اولاد کا!

کسی کے دل میں دولت، شہرت یا منصب کا۔۔۔ یہ سب رشتے اپنی جگہ اللہ کی نعمت ہیں۔ ان سے محبت بھی فطری ہے۔ لیکن جب ہم ان کو خوش کرنے کے لیے اللہ کی نافرمانی کر بیٹھیں، جب ہم ان کی ناراضی سے زیادہ ڈریں اور اللہ کی ناراضی کو ہلکا سمجھ لیں، جب ہم ان کی رضا کے لیے حرام کو جائز بنا لیں۔۔۔ تو پھر ہم کس کو ترجیح دے رہے ہوتے ہیں؟

ہم آرام سے اللہ کی نافرمانی کر لیتے ہیں، لیکن کسی عزیز کی ناراضی برداشت نہیں کر پاتے۔

ہمیں اللہ کے حکم کو توڑنے میں جھجک نہیں ہوتی، مگر کسی بڑے، کسی دوست یا کسی رشتہ دار کو ناراض کرنا گوارا نہیں ہوتا۔

حدیثِ نبوی ﷺ کا مفہوم ہے: ”خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔“ یعنی اگر کسی انسان کی بات ماننے کے لیے اللہ کے حکم کو توڑا جائے تو وہ اطاعت حرام ہے۔

پھر ذرا رک کر سوچیں۔۔۔ کہیں ہم بھی تو نفس، اولاد یا معاشرے کی خوشنودی کے لیے حرام کا راستہ تو اختیار نہیں کر لیتے؟

آئیے! آج اپنے دل میں جھانکیں۔

کیا واقعی ہمارے اندر کوئی ایسا بت موجود ہے، جس کی رضا کے لیے ہم خالق کی رضا کو پیچھے کر دیتے ہیں؟

اگر جواب ”ہاں“ ہے تو یہی لمحہ ہے ان بتوں کو توڑنے کا۔۔۔ پتھر کے نہیں، دل کے بت۔

آئیے! اپنا چہرہ، اپنا دل، اپنی محبت اور اپنی زندگی پوری طرح اپنے رب کی طرف موڑ دیں اور آج ہم بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنے ارد گرد اور اپنے دل کے تمام بت توڑنے کا عزم کریں۔

جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک بت پرست قوم میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباء واجداد بھی بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ چاروں طرف شرک کا غلبہ تھا، لیکن وہ سب سے لاتعلق ہو کر فقط اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو گئے اور اعلان کر دیا: ”میں نے یکسو ہو کر اپنا رُخ اس ذات کی طرف کر لیا ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔“ (الانعام: 79) یہی اصل توحید ہے۔

دل کا رُخ، نیت کا رُخ، محبت کا رُخ، خوف اور اُمید کا رُخ، سب صرف اللہ کی طرف ہو اور جو ایمان لائے، وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

Shangrila
THE FOOD EXPERTS!
GARLIC CHILLI SAUCE
Shangrila
THE FOOD EXPERTS!
GARLIC CHILLI TOU MUST HAI!

آخری حصہ

ناریل

حکیم شمیم احمد

ناریل کے پانی سے جسم صحت منداور توانا

ناریل سے ہمیں پوٹاشیم اور وٹامن بی حاصل ہوتا ہے۔اب تک ناریل کے جو فائدے ہمیں معلوم ہوئے ہیں وہ مثبت ہیں،ان کا کوئی نقصان سامنے نہیں آیا ہے۔عام پانی کے بر عکس ناریل کا پانی میٹھا،مزیدار اور شفا بخش ہوتا ہے۔اس کے فائدے بہت ہیں،اس پانی کی مفید خاصیتوں کی بنا پر اسے ساری دنیا میں پیا جاتا ہے۔اس کا پانی آسانی سے اور کم قیمت پر دستیاب ہو جاتا ہے۔یہ ہمیں اندرونی طور پر ہی صحت مند نہیں رکھتا بلکہ ہم باہر سے بھی توانا اور صحت مند نظر آتے ہیں۔جسمانی طور پر جب ہم محنت ومشقت کا زیادہ کام کر لیتے ہیں تو ہمارے جسم میں پانی اور معدنیات کم ہو جاتے ہیں۔ناریل کا پانی ایسی کمی کو پورا کر دیتا ہے۔جب آپ زیادہ ورزش کر لیتے ہیں یا طویل بیماری سے نقاہت طاری ہو جاتی ہے تو ایسے میں ناریل کا پانی پینا فائدے مند ہوتا ہے۔

ناریل کا لڈو

ایک مریضہ شدید بیماری کے بعد جب وہ صحت یاب ہوئی تو اس کی نگاہ بے حد کم زور ہو چکی تھی اور وہ کہتی تھی کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ جاتا ہے۔دماغ کی حالت تھی کہ کروٹ لینے سے ایسا لگتا جیسے اندر کوئی چیز ہل رہی ہے۔نقاہت کی وجہ سے زیادہ چل پھر بھی نہیں سکتی تھیں۔ پھل، عرقیات اور اچھی غذائیں دینے کے باوجود کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔ مریضہ کو ناریل کدوکش کر کے کوٹ کر مصری ملا کر لڈو تیار کر کے روزانہ نہار منہ ایک لڈو چبا کر کھانے کا مشورہ دیا۔لڈو کے مسلسل استعمال سے کم زوری دور ہو گئی دماغ کا ہلنا اور ضعفِ بصارت بھی ٹھیک ہو گئی۔

ناریل گودے دار پھل

ناریل میں ریشے کی بہتات ہوتی ہے اور یہ گودے دار پھل ہے۔اس کا گودا ایک سخت تہہ کے اندر ہوتا ہے۔ آلوچہ اور زیتون کی طرح اس کا بیج بھی اوپر سے سخت چھلکے میں بند ہوتا ہے۔اس کی تین تہیں ہوتی ہیں۔اوپری سخت تہہ،اندرونی نرم وملائم اس کے بعد لکڑی کی طرح سے سخت تہہ جس میں بیج بند ہوتا ہے۔

ثابت ناریل

ثابت ناریل میں گوند ببول اور مغزیات بھر کر بنایا جاتا ہے جو زچہ کو فائدہ دیتا ہے۔ثابت کھوپرے کا اوپر سے ٹکڑا اتار کر اس میں گوند ببول، پستے اور چاروں مغز بھر دیں اور ٹکڑا دوبارہ لگا کر آٹا گوندھا ہوا چاروں طرف لپیٹ دیا جائے، پھر اسے تین کلو دودھ میں ہلکی آنچ پر پکاتے رہیں۔جب دودھ خشک ہو جائے تو ناریل نکال کر کوٹ لیں اور اس کو گھی میں تھوڑی چینی ملا کر اور اصلی گھی کے ساتھ بھونا جائے۔ ٹھنڈا ہونے پر مرتبان میں محفوظ کر لیں۔ صبح وشام ایک چمچہ روزانہ کھانے سے کمر مضبوط ہوتی ہے اور زچہ کی کم زوری دور ہو جاتی ہے۔دبلے پتلے لوگ ناریل کھا کر وزن بڑھا سکتے ہیں۔

ناریل ایک قدرتی پانی

ڈاکٹر چوغہ بمبئی کے کینسر اسپتال میں ناریل کا پانی معدے اور منہ کے کینسر میں کثرت سے استعمال کرواتے تھے۔ گردے کی پتھری والے مریض ناریل کے پانی کو اپنے معمول کی خوراک میں لازمی جزو کی حیثیت سے شامل کریں، کیوں کہ یہ پانی پتھریاں توڑ کر خارج کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پیشاب کی جلن ہو یا کوئی انفیکشن ایک گلاس ناریل کا پانی پینے سے فوراً افاقہ ہو جاتا ہے۔ناریل کے پانی میں نمک کی مقدار اتنی کم ہوتی ہے کہ خون کے سرخ ذرات بالکل محفوظ رہتے ہیں۔اس لیے یہ دل اور بلڈ پریشر کے امراض میں بھی مفید ہے۔یہ قدرتی پانی جسم میں بیماریوں کے خلاف قوّتِ مدافعت پیدا کرتا ہے،جس کے باعث جسم بیماریوں سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

ناریل کے تیل سے بالوں میں نمایاں فرق

جن لوگوں کے بال باریک، خشک اور چھریرے ہوں تو وہ ناریل کے تیل کے آدھ پیالے میں بھیڑ کا دودھ شامل کر کے رکھ دیں۔دو گھنٹے بعد اسے خوب ملا کر سر میں مالش کریں، پھر سر دھو لیں۔ ہفتے میں ایک بار ایسا کرنے سے خشکی دور ہو کر بالوں میں چمک آ جائے گی۔ پہلی بار تھوڑا تیل سر پر لگائیں، کیوں کہ بعض لوگوں کو یہ موافق نہیں آتا،سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ناریل کا تیل اپنے سامنے نکلوائیں اور اس کی کھلی بھی ساتھ لے آئیں اور اس سے سر دھوئیں۔ان شاء اللہ بالوں میں نمایاں فرق محسوس ہو گا۔ناریل مردانہ اور زنانہ امراض میں بھی مفید ہے۔

ناریل کا تیل

کام کی زیادتی، نیند کی کمی یا ناقص غذائیں کھانے سے آپ ذہنی دباؤ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ناریل کے تیل کی خوشبو سے آپ پُر سکون نیند سو سکتے ہیں اور ذہنی دباؤ پر قابو پا سکتے ہیں۔ بالوں میں دھیرے دھیرے دائرے کی شکل میں مساج کرنے سے چند لمحوں بعد دماغی تھکن سے نجات مل جاتی ہے اور سکون حاصل ہوتا ہے۔جاڑوں میں جلد کی تر وتازگی کے لیے کریموں اور لوشنوں کا استعمال بڑھ جاتا ہے۔ناریل کے تیل میں شامل حیاتین ھ (وٹامن ای) جلن دور کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔یہ آپ کو صحت مند رکھتی ہے اور شحمی غدود سے خارج ہونے والی رطوبت کو قابو میں رکھتی ہے۔شریانوں میں اگر چکنائی سے خون کی روانی متاثر ہو رہی ہے تو اسے دور کرتی ہے۔ناریل کے تیل کی براہِ راست چہرے پر دو یا تین منٹ تک مالش کی جا سکتی ہے۔بہتر ہو گا کہ پانچ منٹ تک اس کی مالش کریں، پھر چہرے کو ٹشو پیپر سے صاف کر لیں۔ایک دن چھوڑ کر اس میں ایک چمچہ گھیکوار کی جیلی ملا کر چہرے پر دس منٹ کے لیے لگایا جا سکتا ہے۔اس کی پانچ منٹ تک دائرے کی شکل میں مالش کریں۔پھر چہرے کو سادہ پانی سے دھو ڈالیں۔اس آمیزے کو استعمال کرنے سے جلد نرم وملائم ہو جاتی ہے۔اس سے داغ دھبے دور ہو جاتے ہیں اور کیل مہاسے بھی نہیں رہتے۔

سعدیہ اجمل

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ

جرأتوں کا نشاں خالد ابنِ ولید کفر کا امتحاں خالد ابن ولید

نام خالد، کنیت ابو سلیمان، لقب سیف اللہ تھا اور یہ لقب آپ رضی اللہ عنہ کو بارگاہِ رسالت سے عطا ہوا۔

جنگِ موتہ کے موقع پر جب حضرت زید بن حارثہ و حضرت جعفر بن ابی طالب و حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تینوں سپہ سالاروں نے یکے بعد دیگرے جامِ شہادت نوش کر لیا تو اسلامی فوج نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اپنا سپہ سالار منتخب کیا۔ انھوں نے انتہائی دلیری و جاں بازی کے ساتھ جنگ کی اور مسلمانوں کو فتحِ مبین ہو گئی۔

اسی موقع پر جب یہ جنگ میں مصروف تھے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منوّرہ میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی ایک جماعت کے سامنے ان کو "سیف اللہ" (اللہ کی تلوار) کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

آپ رضی اللہ عنہ خاندانِ قریش کے بہت ہی نامور اشراف میں سے تھے۔ ان کی والدہ حضرت "لبابہ" اُمُّ المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بہن تھیں۔

ابتدا ہی سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی شناخت ایک جرأت مند اور زِیرک سپاہی کی تھی۔ ان کے محیّر العقول اور ولولہ انگیز جنگی کارنامے دیکھ کر ماہرینِ حرب و ضرب انگشتِ بدنداں رہ گئے۔

حضرت خالدؓ بن ولید نے 41 بڑی جنگوں میں شرکت کی، 15 سال میدانِ جنگ میں رہے اور اپنی زندگی کے صرف آخری سات برسوں میں 35 معرکوں میں شامل ہوئے۔

انھوں نے کسی عہدہ و منصب کے بغیر بھی اپنے فرض کی ادائیگی اور نظم و نسق کی پابندی کی ایک ایسی روشن مثال قائم کی ہے جو رہتی دنیا تک یاد رکھی جائے گی۔

حضرت خالد بن ولیدؓ ہی ملتِ اسلامیہ کے وہ عظیم جرنیل کہ جنھوں نے قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کو پامال کر ڈالا، روم و ایران کے شاہی محلّات روند ڈالے۔

آپ رضی اللہ عنہ اللہ کی وہ تلوار ہیں کہ جو کفّار، مشرکین، مرتدین، یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں پر قہر بن کر نازل ہوئی۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے انتقال کا وقت قریب آیا تو وہ رونے لگے اور فرمایا کہ؛

"اتنی اتنی (یعنی بہت زیادہ) جنگوں میں شریک ہوا ہوں اور میرے جسم میں بالشت بھر جگہ ایسی نہیں ہو گی، جس میں تلوار یا نیزے یا تیر کا زخم نہ ہو اور دیکھو! اب میں اپنے بستر پر ایسے مر رہا ہوں، جیسے کہ اونٹ مرا کرتا ہے، یعنی مجھے شہادت کی موت نصیب نہ ہوئی۔"

نیز آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ؛ "دنیا کے بزدلوں کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ اگر میدانِ جہاد میں موت لکھی ہوتی تو اس خالد بن ولیدؓ کو موت بستر پر نہ آتی۔" 18 رمضان 21 ہجری کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی۔

وفات کے وقت آپ رضی اللہ عنہ کے ورثے میں ایک گھوڑے اور سامانِ حرب کے سوا کچھ نہ تھا۔

ناریل کے تیل سے بیکٹیریا کا مکمل خاتمہ

ناریل کا تیل دانتوں کے لیے بھی مفید ہے۔ کھانے کے سوڈے میں ہم وزن ناریل کا تیل ملا کر پیسٹ بنا لیں اور اس سے دانت صاف کریں۔ یہ پیسٹ آپ کے دانتوں کو خراب ہونے سے محفوظ رکھے گا۔ ناریل کے تیل میں زخم مندمل کرنے کی خاصیت بھی ہوتی ہے۔ جسم کے کٹ جانے والے حصوں اور خراشوں پر اسے لگایا جائے تو ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے اور سکون ملتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بیکٹیریا کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ کسی کیڑے کے کاٹنے سے زخم ہو جائے تو ناریل کا تیل لگانا چاہیے، یہ اس کے زہریلے اثرات کو ختم کر دیتا ہے۔

ناریل کے پانی اور تیل کی کرشمہ سازی

- ناریل کا پانی معدے کی سوجن کو بہتر کرتا ہے اور معدے کے السر میں بے حد مفید ہے۔
- ناریل کا پانی پیشاب کی کثافت اور غلاظت کو دور کرتا ہے طاقت دیتا ہے۔
- بانجھ مرد اور عورتوں کو ناریل ضرور کھانا چاہیے، تاکہ وہ اولاد جیسی نعمت سے محروم نہ ہوں۔
- پھیپھڑوں کے مریضوں کے لیے ناریل کا دورہ غذائی اہمیت رکھتا ہے۔
- گردوں کے لیے مفید ہے، مثانہ کی معمولی خرابیاں ناریل کھانے سے دور ہو جاتی ہیں۔
- ہڈیوں اور جوڑوں کے درد پر ناریل کے تیل کا استعمال درد کو رفع کر دیتا ہے۔
- ناریل کا دودھ گلے کی خراش اور تمباکو نوشی سے ہونے والی خشک کھانسی کا بہترین علاج ہے۔
- ناریل کے پانی میں ایک چمچ لیموں کا رس ملا کر پینے سے ہیضہ کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔
- ناریل کا تیل بالوں کو گرنے سے روکتا ہے اور مسلسل استعمال سے بال خوشنما ہو جاتے ہیں۔ اس تیل میں چند قطرے زیتون کا تیل اور چند قطرے لیموں کا رس شامل کر کے بالوں پر لگانے سے بال چمکدار اور سلکی ہو جاتے ہیں۔
- سبز رنگ کا کچا ناریل جسے ڈاب بھی کہا جاتا ہے، یہ پانی سے بھرا ہوتا ہے۔ اس کے اندر گہری بالائی جیسی کریم ہوتی ہے۔ اس کا پانی بیشمار فوائد کا حامل ہے۔
- ناریل جسم کو کیلشیم جیسی معدنیات جذب کرنے میں مدد دیتا ہے، جس سے ہڈیاں مضبوط ہو جاتی ہیں۔
- پرانی چوٹ پر ناریل اور تھوڑی ہلدی ملا کر پوٹلی بنا کر گرم کر کے سینک دیں تو سوجن اور چوٹ ٹھیک ہو جاتی ہے۔
- ناریل کے دودھ میں ماں کے دودھ والے منرلز ہوتے ہیں جو کہ شیر خوار بچوں کے لیے مناسب مقدار میں بے حد مفید ہیں، لہٰذا ناریل کا دودھ بچوں کے لیے اور دودھوں سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔

اپریل فول

بڑھتی ہوئی معاشرتی بیماری

دانیال حسن چغتائی

مذہب اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے، جو اپنی منفرد تہذیب اور واضح شناخت رکھتا ہے۔ اس کے اندر زندگی گزارنے کے طور طریقے، اصول اور اسلوب نہایت وضاحت سے بیان کر دیے گئے ہیں۔ ہمارے مذہب نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو اس طرح نمایاں کیا ہے کہ ہر برائی اور اچھائی کی پہچان آسان ہو جاتی ہے۔

مگر افسوس کا مقام یہ ہے کہ دورِ جدید میں ہم اپنی شناخت بھولتے جا رہے ہیں۔ ہم غیروں کی رسم و رواج کو فیشن سمجھ کر منانے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور ان میں اس طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں جیسے کوئی اہم دینی یا ملی فریضہ سر انجام دے رہے ہوں۔ انہی غیر اسلامی رسومات میں سے ایک اپریل فول بھی ہے۔

تاریخ کے اوراق پلٹنے سے اپریل فول کی جو حقیقت سامنے آتی ہے، وہ نہایت دردناک ہے۔ اسپین پر تقریباً آٹھ سو سالہ مسلم حکمرانی کے بعد جب عیسائیوں نے اسے فتح کیا تو وہاں ہولناک خون ریزی ہوئی۔ عیسائی فاتحین کے گھوڑے جب شہر کی گلیوں سے گزرتے تو ان کی ٹانگیں گھٹنوں تک مسلمانوں کے خون میں ڈوب جاتی تھیں۔

جب عیسائیوں کو یہ محسوس ہوا کہ کچھ مسلمان ابھی بھی روپوش ہیں تو انھوں نے مکروہ منصوبہ بنایا۔ ماہِ مارچ میں یہ اعلانات کروائے گئے کہ یکم اپریل کو تمام مسلمان غرناطہ میں اکٹھے ہو جائیں، تاکہ انھیں ان کے آبائی ممالک میں بحفاظت بھیج دیا جائے۔ مسلمانوں کو یقین دلانے کے لیے الحمراء کے قریب میدانوں میں خیمے لگائے گئے اور سمندر میں جہاز لنگر انداز کیے گئے۔ ان ظاہری تیاریوں نے مسلمانوں کو باور کروا دیا کہ اب وہ محفوظ ہیں۔

اسی اُمید کے ساتھ مسلمان، جن میں بچے، بوڑھے، خواتین، بیمار اور زخمی شامل تھے، جوق در جوق غرناطہ میں جمع ہو گئے۔ انھیں بحری جہازوں میں بٹھا کر روانہ کر دیا گیا، لیکن جب جہاز سمندر کے وسط میں پہنچے تو پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت ان کے نچلے حصوں میں سوراخ کر دیے گئے۔ عیسائی افواج حفاظتی کشتیوں کے ذریعے فرار ہو گئیں اور ہزاروں بے گناہ مسلمان سمندر کی لہروں کی نذر ہو گئے۔ اس خونی کامیابی کی خبر جب اسپین کے محلّات میں پہنچی تو جشن منایا گیا اور رفتہ رفتہ یہ دن اپریل فول یعنی یکم اپریل کے بیوقوف کے نام سے پورے یورپ اور پھر مسلم ممالک میں بھی مشہور ہو گیا۔ آج ہم مسلمان اس دن کو جس انداز میں مناتے ہیں، وہ ہماری شرعی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کے بالکل منافی ہے۔ مذاق کی آڑ میں جھوٹے پیغامات بھیجنا اور دوسروں کو پریشان کرنا اسلامی بلکہ فطری طور پر بھی گری ہوئی حرکت ہے۔ کسی بھی رنگ، نسل یا مذہب میں جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم غیروں کی اندھی تقلید کے بجائے اپنی شخصیت میں وہ اوصاف پیدا کریں کہ ہماری ذات سے لوگوں کو تکلیف کے بجائے نفع پہنچے۔

اسلام میں جھوٹ کی مذمت نہایت سختی سے کی گئی ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: پس پرہیز کرو بتوں کی نجاست سے اور جھوٹی بات سے۔ (الحج:30)

بے شک جھوٹ وہی لوگ گھڑتے ہیں جو اللہ کی نشانیوں پر ایمان نہیں لاتے اور وہی لوگ جھوٹے ہیں۔ (النحل:105)

فرامین رسول اللہ ﷺ بھی اس ضمن میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”منافق کی تین علامتیں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔“ (صحیح بخاری)

ایک اور مقام پر سخت وعید سناتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”افسوس ہے اس شخص پر اور دردناک عذاب ہے جو محض لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے۔“ (ابو داؤد)

اپریل فول ایسی بدعت ہے، جس کی بنیاد مکر و فریب اور مسلمانوں کی تذلیل پر رکھی گئی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ایسی لایعنی اور غیر اخلاقی رسومات سے خود بھی بچیں اور اپنی نسلوں کو بھی اس بڑھتی ہوئی بیماری سے محفوظ رکھیں۔

دھوبی کے پاس میلا کپڑا ہی آتا ہے:

حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ علیہ کے پاس اس طرح ایک نوجوان آتا تھا، جس پر مختلف الزامات تھے۔ لوگوں نے آکر کہا: ”حضرت! آپ اس کو اپنے پاس آنے سے منع فرما دیں، بدنامی ہو رہی ہے۔“

حضرت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فرمایا: ”دیکھو! میری مثال تو دھوبی کی سی ہے جو کپڑے کو دھوتا ہے اور دھوبی کے پاس تو گندے کپڑے ہی آیا کرتے ہیں، صاف ہو گا تو وہ دھوبی کے ہاتھ میں آئے گا ہی کیوں؟“

بھئی اگر یہ سارے ہی اچھے ہوں تو پھر گھر میں بیٹھ کر آرام سے وقت گزاریں۔ یہ تو آتے ہی اس لیے ہیں انھیں محسوس ہوتا ہے کہ دھلنے کی ضرورت ہے، کسی واشنگ مشین (washingmachine) میں رہ کر اپنے دل کے داغ دور کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ گھروں کو چھوڑنا کوئی آسان کام ہے؟ بیوی بچوں کو چھوڑنا، اپنی مصروفیات کو ترک کرنا آج کہاں آسان ہے؟ ملک سے غیر ملک سے جب کوئی چل کر آتا ہے تو اس کے دل میں کوئی احساسِ ندامت ضرور ہوا کرتا ہے۔ اس لیے اُس پر نہ روئیں جس نے گناہ کیا، اپنے اوپر روئیں کہ میرا دل اتنا بدگمانی کرنے والا ہے ہی کیوں؟

تعلیم یافتہ عورت
مضبوط معاشرے کی بنیاد

آمنہ عبدالباسط

حضرتِ انسان پر ایسا وقت بھی آیا جب اسے علم کے "ع" سے واقفیت نہ تھی۔ رہن سہن کا انداز، معاشرت کا طریقہ کار اور ذرائع آمدن کسی طور مناسب نہ تھے۔ خاندان جیسی "اکائی" کا تصوّر تقریباً ناپید تھا۔

پھر اسلام آیا اور تہذیب کی بہار آگئی۔ انسانیت کو زندگی گزارنے کا سلیقہ دیا تو شعور، علم اور آگہی کا تحفہ خاص طور پر ودیعت کیا گیا۔ دنیا پہ رہنے کے اصول و قوانین وضع کیے گئے اور بندوں کو آپس میں حقوق و فرائض کی خوب صورت کڑی کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔

اسلام میں جس طرح نماز روزہ زکوۃ اور حج فرض کئے گئے ہیں، اسی طرح مرد و زن کے لیے تعلیم حاصل کرنا بھی فرض قرار دیا گیا، تاکہ جہالت کے اندھیروں میں ڈوبے بنی نوع انسان ترقی و خوشحالی کی معراج کو چھو سکیں۔

پھر جب بات خواتین کی تعلیم و تربیت پہ آجائے تو اسلام وہ احکام پیش کرتا ہے جن کی رہتی دنیا تک مثال نہیں ملتی۔

چناں چہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس نے تین لڑکیوں کی پرورش کی، ان کی اچھی تعلیم و تربیت کی، ان سے حسن سلوک کیا، پھر ان کا نکاح کر دیا تو اس کے لیے جنّت ہے۔" (ابوداؤد)

مذکورہ بالا ارشادِ کریمہ میں ایک امر خواتین کی "اچھی تعلیم و تربیت" بھی ہے جس پہ جنّت کی بشارت دی گئی ہے۔

یہی وہ جوہر نایاب ہے جو خواتین کو ممتاز و معزز تو کرتا ہی ہے۔ ساتھ ساتھ گھر، خاندان، قوم اور معاشرے تک کو سنوار دیتا ہے۔ ہر دور میں تعلیم حاصل کرنے پہ زور دیا گیا ہے، لیکن موجودہ دور میں خواتین کی تعلیم بنیادی جُز بن چکی ہے۔

مہدِ مادر بچے کی پہلی درسگاہ ٹھہرائی جاتی ہے، جہاں سے وہ بولنے، اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کے آداب سے لے کر باوقار شہری بننے تک کے اصول سیکھتا ہے۔ اگر وہ ماں تعلیم یافتہ ہے، صحیح اور غلط کا ادراک رکھتی ہے، حق و باطل میں تمیز کر سکتی ہے تو بلاشبہ یہی خوبیاں اس کی اولاد میں بدرجہ اُتم موجود ہوں گی، کیوں کہ وہ اولاد براہِ راست ماں سے شائستگی اور اعلیٰ مزاجی سیکھتی ہے!

اگر ایک خاتون تعلیم جیسے نور سے محروم ہو تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے ساتھ پوری نسل کے لیے باعثِ آزار بن جاتی ہے۔ دراصل تعلیم یافتہ عورت جس طرح دین پہ قائم رہتی ہے، فرائضِ منصبی ادا کرتی ہے، امورِ خانہ داری انجام دیتی ہے، اُسی طرح زمانے کی اونچ نیچ میں اپنے خاندان کے ساتھ پشت جوڑ کر کھڑی رہتی ہے۔ اس کا علم، فکری سوچ، ذہنی پختگی اور نظر کی بلندی خاندان کو کبھی ڈگمگانے نہیں دیتی۔

حتیٰ کہ اگر کبھی بیرونی ذمہ داریاں یا روزگار کے مسائل بھی اس پر آپڑیں تو وہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے کی بجائے ان سے نبرد آزما ہو جاتی ہے اور آخر کار ان پہ قابو پا لیتی ہے۔ وہ دلوں کو جوڑ کر رکھنے کا ہنر تو جانتی ہے، لیکن اپنے تعلیم و شعور سے بڑے بڑے ادارے بھی سنبھال لیتی ہے۔

تعلیم یافتہ خاتون اپنی عزت نفس کی حفاظت کرنا تو جانتی ہی ہے، لیکن وہ اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں اپنے خاندان کی عزت اور اموال کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ انسانی حقوق کے استحصال کو روکنا اس کی اوّلین ذمہ داری بن جاتی ہے۔ وہ جدید علوم وفنون سے روشناس ہونے کی بنا پہ ہر میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑھتی ہے۔ ایسی خاتون جب اولاد کی صورت میں اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی پرورش کرتی ہے تو دنیا میں بہترین مرد پروان چڑھتے ہیں۔ جنھیں قوام کہا گیا ہے۔ اور ایسی عورتیں جنم لیتی ہیں جنھیں "خوب صورت نگینوں" سے تشبیہ دی گئی ہے!

یہی مرد اور عورتیں مہذب معاشرے کا ستون بنتے ہیں، جن سے ملک ترقی کی شاہراہ پہ قدم رکھتے ہیں۔ قومیں نئی تاریخ رقم کرتی ہیں اور انسانیت محبت، اخوت اور امن کے نئے جہان سے منوّر ہوتی ہے۔ درخت زمین کا زیور ہیں تو تعلیم کو انسان کا زیور کہا گیا ہے۔ وہی زیور جس کے بغیر زمین بنجر، ویران اور ناہموار رہتی ہے اور اس کے ساتھ ہری بھری سرسبز و شاداب اور فائدے سے لدی رہتی ہے۔ اسی طرح خواتین بھی علم جیسے زیور کے بغیر عقل و شعور سے بیگانہ اور ویران جھاڑی کی مانند ہیں جن سے فائدہ ملنا خال خال ہی ممکن ہے۔

خواتین کی تعلیم و تہذیب ہی وہ روشنی ہے، جن کی ضیا سے ملک و ملت کا پہیہ رواں دواں رہتا ہے! دراصل تعلیم یافتہ عورت ہی مضبوط معاشرے کی بنیاد ہے!!!

اللہ تعالی ہم سب کو علم نافع عطا کریں اور دین کی صحیح سمجھ بوجھ عطا کریں، تاکہ آنے والی نسلوں کی راہیں ہمیشہ روشن رہیں۔ آمین

ایک شبہے کا جواب:

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: بعض لوگ زیارتِ روضۂ اطہر پر ایک شبہ کرتے ہیں کہ قبر کی بھی زیارت نہیں ہوتی، کیونکہ قبر شریف نظر نہیں آتی، اس کے گرد پتھر کی دیوار قائم ہے جس کا دروازہ بھی نہیں۔ یہ عجیب اشکال ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر زیارتِ قبر کے لیے قبر کا دیکھنا ضروری ہے تو حضور ﷺ کی زیارت کے لیے بھی یہ شرط ہو گی کہ حضور ﷺ کو دیکھا جائے، حالانکہ بعض صحابہؓ نابینا تھے۔ حضرت عبد اللہ ابنِ مکتومؓ صحابی ہیں یا نہیں؟ جس طرح صحابیت کے لیے حکمِ زیارت کافی مانی گئی ہے، اسی طرح زیارتِ قبر شریف میں بھی حکمِ زیارت کو کیوں نہ کافی مانا جائے گا؟" (بحوالہ: اشرف الجواب)

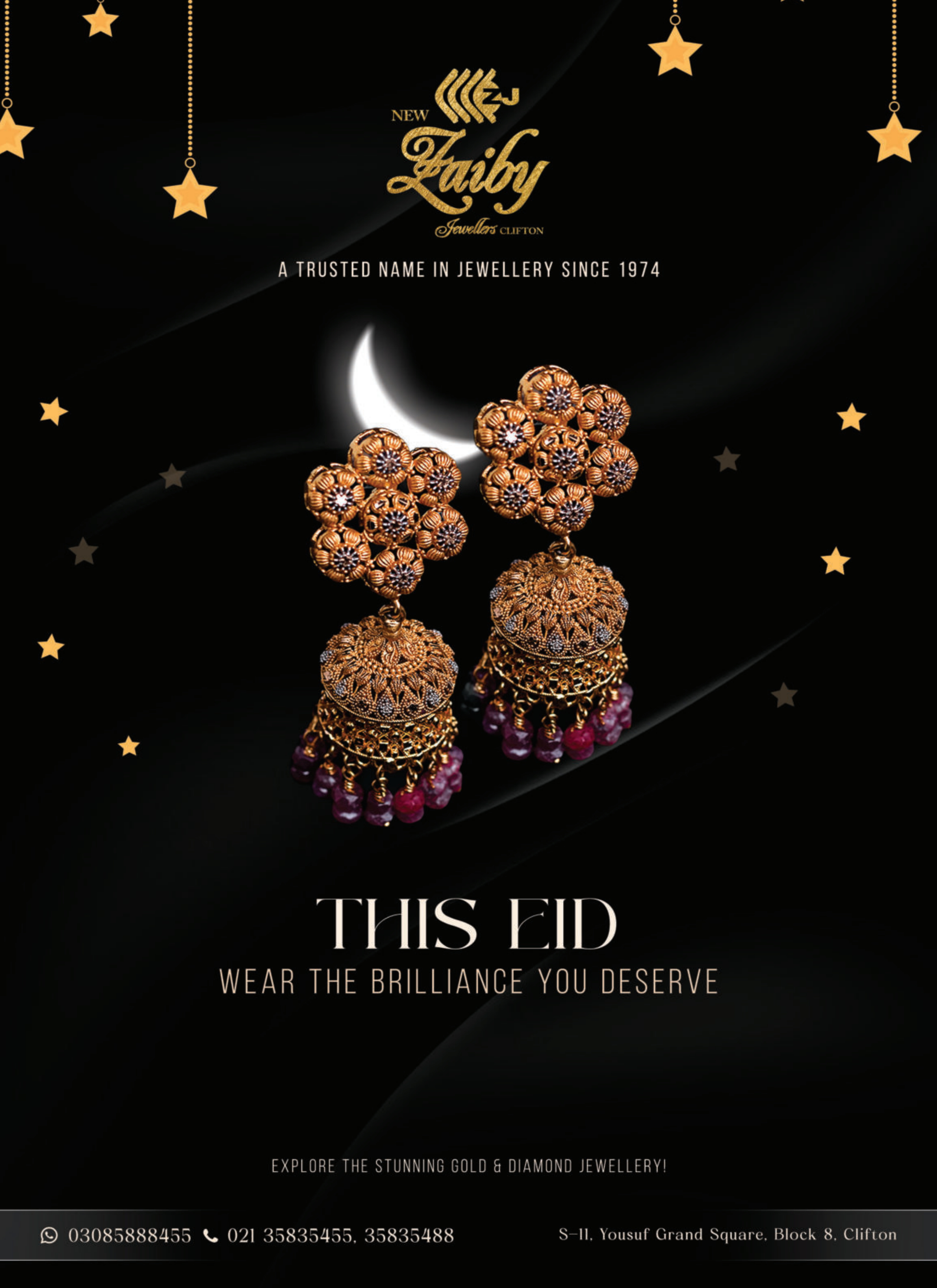
NEW
Zaiby
Jewellers CLIFTON
A TRUSTED NAME IN JEWELLERY SINCE 1974
THIS EID
WEAR THE BRILLIANCE YOU DESERVE
EXPLORE THE STUNNING GOLD & DIAMOND JEWELLERY!
03085888455
021 35835455, 35835488
S-11, Yousuf Grand Square, Block 8, Clifton

آخری حصہ

محبت کی جیت

ثانیہ ساجد

"آپ کو پتا ہے، میں بہت تھک گیا ہوں۔" آواز میں بچوں جیسی شکایت تھی۔

"ظاہر ہے۔۔ صبح سے اب تک کچھ کھایا جو نہیں ہے۔" امی کا جواب آیا۔

"میں اکیلا رہ گیا ہوں امی!" اس کے وجود کا ذرہ ذرہ بس اپنی ماں کو پکار رہا تھا۔

"نہیں بیٹا! تو اکیلا نہیں ہے۔ اللہ ہے نہ تیرے ساتھ!" امی نے تسلی دی۔

"امی! دل بہت بھاری رہتا ہے۔۔۔ عجیب سا وزن ہے سینے پر۔"

"ارے پگلے!" امی نے پیار بھرے ڈانٹ کے ساتھ کہا۔

"یہ سالوں پرانی عداوتیں دل میں پال کر کیوں بیٹھا ہے؟"

امی دنیا میں نہیں تھیں، مگر پھر بھی سب جانتی تھیں۔۔۔ ان کے جانے کے بعد تنویر اور رابعہ کے درمیان کیا ہوا تھا۔

"آپ کو کیسے معلوم؟" وہ چونک کر بولا۔

یہ سوال کرتے ہی اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔۔۔ جیسے اس کے اندر بیٹھی امی مسکرا رہی ہوں۔ "ماں ہوں تم دونوں کی، سب جانتی ہوں۔"

"تو پھر اب میں کیا کروں، امی۔۔۔؟"

"جا کر بہن کے گھر عید مل کر آ۔" امی نے سیدھا حل بتا دیا۔

"نہیں امی! میرا دل نہیں کرتا۔"

"دل تو پاگل ہے، بیٹا!" امی نے ہمیشہ کی طرح سنجیدہ لمحے میں بھی مسکراہٹ گھول دی۔

"دل دیوانا ہے، دل تو بچہ ہے!"

"میں بڑا بھائی ہوں، میں کیوں جاؤں؟" تنویر نے ضد کی۔

"تو بڑا بھائی نہیں ہے۔" امی یک دم تیز ہو گئیں۔

"تو بہت بڑا گدھا ہے اور تیرا یہ بیٹا حذیفہ۔۔۔ بالکل تجھ پر گیا ہے!" امی کو غصہ آ گیا تھا۔

اور تنویر کو اچانک ڈر سا لگنے لگا۔ امی حذیفہ کے بارے میں بھی سب جانتی تھیں۔

"کبھی بہنیں بھی بھائیوں کے گھر عید ملنے آتی ہیں؟" امی کی آواز میں ہلکی سی کاٹ تھی۔

"ہمارے ہاں یہ رواج نہیں ہے۔" یوں امی نے خاندانی اقدار کی جیسے یاد دہانی کرا دی۔

"چل، اٹھ!" امی نے حکم دیا۔

"سیدھی شرافت سے رابعہ کے گھر جا، اس سے عید مل، پھر میرے پاس آنا۔" تنویر نے سر جھکا کر اٹھنا چاہا۔

"اور ہاں۔۔۔" امی کی آواز پھر گونجی۔

"خالی ہاتھ مت جانا۔ مٹھائی یا کیک ساتھ لے جانا۔"

"کون سی مٹھائی لوں؟" وہ ٹھٹک گیا۔

کچھ لمحے وہ امی کی قبر کو تکتا رہا، مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے تھوڑا اور انتظار کیا۔۔۔ خاموشی برقرار رہی۔

"ارے بابا! اب چلیں!" حذیفہ نے تنویر کا ہاتھ کھینچا۔

"راستے سے بقلاوا بھی لینا ہے، عمیمہ کے لیے۔ ناراض ہے ناوہ۔۔۔ اس مٹھائی سے مان جائے گی۔" حذیفہ کی آواز نے تنویر کو پھر بچپن میں دھکیل دیا۔

وہ اور رابعہ بقلاوا کے لیے ایسے لڑا کرتے تھے، جیسے دونوں نے کبھی مٹھائی دیکھی ہی نہ ہو اور تنویر۔۔۔ ہمیشہ اس کے حصے کی مٹھائی میں سے چند ٹکڑے چرا ہی لیتا تھا۔ بقلاوا رابعہ کی پسندیدہ مٹھائی تھی۔ یہ خیال آتے ہی تنویر نے قدم تیز کر دیے۔ طلحہ اور حذیفہ کو ساتھ لیے وہ جلدی جلدی قبرستان سے باہر نکل آیا۔ بائیک پر سوار ہو کر وہ سیدھا مٹھائی کی دکان پہنچا۔ وہاں اس نے ایک کلو بقلاوا کے ساتھ ساتھ ہر دل عزیز گلاب جامن اور حبشی حلوے کا بھی آرڈر دے دیا۔

"اتنی ساری مٹھائی کیوں؟" طلحہ نے حیرت سے پوچھا۔

"پھوپھو کے لیے۔" تنویر نے مختصر سا جواب دیا۔

یہ سنتے ہی طلحہ فوراً حذیفہ کے پاس جا بیٹھا۔ "یار۔۔۔ ہم پھوپھو کے گھر جا رہے ہیں!"

"تجھے کیسے پتا؟" حذیفہ نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

"بابا اتنی ساری مٹھائی انہی کے لیے تو لے رہے ہیں۔"

"لیکن۔۔۔ بابا اور پھوپھو کی تو لڑائی ہے نا؟" حذیفہ نے تشویش کا اظہار کیا۔

"کیا پتا، اب دونوں دوست ہو گئے ہوں اور ہمیں بتایا ہی نہ ہو!" طلحہ نے سرگوشی کی۔

"ویسے ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کی لڑائی کس بات پر ہوئی تھی۔"

"ارے پاگل! تو بھول گیا؟" طلحہ نے یاد دلایا۔

"جب ہم چھوٹے تھے اور پھوپھو کے ساتھ دادا جان کے گھر رہتے تھے، تب ممی اور پھوپھو کی اکثر لڑائی ہوتی رہتی تھی۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن بعد میں سب ٹھیک بھی تو ہو جاتا تھا۔" حذیفہ کو بھی کچھ کچھ یاد آنے لگا۔

"مگر پھر ایک دن بہت بڑی لڑائی ہو گئی تھی۔" طلحہ کی آواز دھیمی ہو گئی۔

"ممی نے پھوپھو سے بہت بدتمیزی کی تھی، ان کے کپڑے بھی اٹھا کر باہر پھینک دیے تھے۔"

"اور پھر پھوپھو نے غصے میں آ کر تمہیں مارا تھا۔"

"پھوپھو نے مجھے مارا تھا؟" حذیفہ حیران رہ گیا۔

"ہاں۔۔۔ اور پھر ممی ہمیں لے کر نانی کے گھر چلی گئی تھیں۔" طلحہ نے بات مکمل کی۔

"اس کے بعد ہی بابا نے ہمارے لیے نیا گھر لیا تھا۔"

حذیفہ نے ایک لمبی سی "اوہ" نکالی، جیسے ساری تصویر ایک ساتھ سمجھ آ گئی ہو۔

"تبھی تو ہم پھوپھو کی شادی میں بھی بالکل مہمانوں کی طرح آتے جاتے تھے۔۔۔" تنویر کے ہاتھوں میں مٹھائیوں کے پارسل تیار ہو چکے تھے۔ وہ دکان سے باہر نکلا تو حذیفہ اور طلحہ

بقیہ صفحہ نمبر 21 پر

اُمید کا دیا

نگہت فرمان

گھر کے آنگن میں دھوپ پھیل رہی تھی، مگر شیما کے اندر جیسے ہمیشہ اداس بے نام سی شام بسی تھی، جو وداع کے دن اس کے ساتھ آئی تھی اور کبھی رخصت نہ ہوئی۔ وہ شادی سے پہلے ہر موسم کے مزے لینا جانتی تھی۔ جاڑوں کی سرد راتیں، بہار میں کھلتے رنگ برنگے پھول، گرمیوں کی ساحلی ہوائیں ہر منظر جیسے اس کے کھلکھلاتے ہنستے وجود کو اور رعنائی دیتا تھا۔۔۔ والدین کا آنگن اس کی آوازوں سے گونجتا رہتا، ماں کی ڈانٹ میں چھپی محبت اور باپ کا فخر و مان اسے مضبوط رکھتا تھا۔ اتنا مضبوط کہ وہ ہر آزمائش میں سُرخرو ٹھہری تھی پھر۔۔۔ ہاتھوں میں مہندی لگی تو اس نے خود ہی ایک خواب بُن لیا کہ نیا گھر نیا جہاں ہوگا، جہاں اس کی قدر بھی ہوگی اور اس کی محبت بھی قبول ہوگی، لیکن خواب تو کم ہی پورے ہوتے ہیں، ورنہ اکثر تو ان کی کرچیوں سے لہولہان ہوتے ہی دیکھا ہے۔۔۔ اس کے لیے نیا گھر ایسا ہی تھا جہاں وہ ہر روز صبح ایک خواب بُنتی اور رات کو تھک کر اس کی کرچیاں سمیٹ رہی ہوتی۔ اسے ہر کوئی یہی سمجھاتا اور اسے خود بھی لگتا وقت کے ساتھ سب بدل جائے گا، لیکن دن گزرتے گئے اور کچھ بھی نہ بدلا! بس اس کی قربانیوں کا وہ وزن بڑھتا گیا جو کسی کو محسوس بھی نہیں ہوتا تھا۔ دن بھر کی تھکان کے باوجود رات کو نیند سے زیادہ اسے اپنی وہ ادھوری خواہشات جن کی تکمیل کے لیے نہ پیسہ چاہیے تھا نہ ہی بے پناہ وقت۔ بس احساس کی ضرورت تھی، کانٹوں کی طرح چبھ رہی ہوتی۔ اسے یاد آیا، جب امی نے اس کے نکاح کے بعد اس سے کہا تھا: ”بیٹا! گھر محبت سے سنورتے ہیں، بس ایثار و محبت سے سب کو اپنا بنالینا۔“ میں نے تو اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا، پھر بھی کیوں نہیں سنور رہا؟ وہ خود سے ہم کلام ہوتی۔

وقت دیمک کی طرح ہوتا ہے، وہ باہر سے لکڑی کو ٹھیک ٹھاک رکھتا ہے، مگر اندر ہی اندر اسے کھوکھلا کر دیتا ہے۔ شیما بھی اسی طرح کھوکھلی ہو رہی تھی۔ اس کے اندر ایک ایسا خلا بنتا گیا جس میں روشنی کی کوئی لکیر نہ پہنچتی ہو۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی سہیلیوں کے گھروں سے اپنا موازنہ کرتی تو اس کا احساسِ محرومی مزید دوچند ہو جاتا۔

اس کی دوست ثمن کا گھر محبت کی خوشبو سے بھرا ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے جھگڑے، پھر مسکراہٹیں، ایک دوسرے کا خیال۔۔۔ شیما جب وہاں جاتی تو دل کے اندر ایک جھماکا سا ہوتا، وہ سوچتی، ”کیا میں اتنی محبت کے بھی قابل نہیں؟“ پھر مریم اس کی بچپن کی سہیلی کے شوہر مصروف رہتے، مگر محبت میں کمی نہیں آتی۔ کبھی ایک حال پوچھنے کا پیغام، کبھی ایک کپ چائے کی پیشکش، کبھی ہلکا سا مذاق۔۔۔ شیما ان دونوں کی باتیں سن کر رشک بھی کرتی اور عجیب سی ٹیس بھی اُٹھتی۔ سہیلیاں اس سے پوچھتیں: ”کبھی تو ہمارے بہنوئی جی نے تیمارداری کی ہوگی، چائے بنا کر دی ہوگی وغیرہ؟“ وہ مسکراتی اور کہتی: ”وہ ایسے نہیں ہیں۔۔۔“ مگر اندر کوئی چیخ رہا ہوتا، ایسے کیوں نہیں ہیں؟ کیا میرا دل پتھر کا بنا ہے؟ میرا جی نہیں چاہتا کہ کوئی تو اس گھر میں میرا حال بھی پوچھے؟

اسے جانے کیوں اپنے اطراف ایسے ہی مناظر نظر آتے۔ یہ شاید انسان کی نفسیات ہے کہ وہ جس محرومی کو لے کر حساسیت کی انتہا پر ہوتا ہے، اسے سامنے کے عام مناظر و واقعات بھی انہونے لگتے اور اپنی کم مائیگی کا احساس دلا رہے ہوتے ہیں۔

اپنے محلے کا وہ جوڑا اسے ہمیشہ اپنی جانب متوجّہ رکھتا، جہاں شوہر کبھی کبھار شام کو گھر آتے ہی بیوی کے لیے چھوٹی چھوٹی چیزیں لے کر آتا۔ کبھی سنیکس، کبھی پھول، کبھی بیوی کی من پسند کوئی اور چیز۔۔۔ دوسرا وہ، جہاں میاں بیوی روز صبح اکٹھے واک پر جاتے۔ ہاتھ میں ہاتھ نہیں ہوتا تھا، مگر ساتھ ہونے کا احساس دُور سے محسوس ہوتا تھا۔ اسے یہ طوطا مینا لگتے۔ وہ جب کھڑکی سے انھیں دیکھتی تو ان کے لیے دعا ضرور کرتی۔۔۔

وہ سوچتی، ”آخر شوہر کی محبت ہوتی کیسی ہے؟ کیا میں نے اس کا ذائقہ کبھی چکھا بھی ہے؟“ اس کے گھر میں تو جیسے بے حسی کا راج تھا۔ بات چیت کم، صرف ضرورت کے تحت اور روز کے وہی سوال جیسے بیوی نہیں، آیا ہو۔۔۔

بچوں کی پیدائش کے بعد اس کے اندر اُمید جاگی تھی کہ شاید اب انھیں میرا خیال ہو، میری جانب دیکھیں کچھ الفت ہو، لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ یہ شخص جو بچوں کا باپ ہے، اس کے لیے شاید پہلے سے بھی زیادہ بے حس و لاتعلق ہو چکا تھا۔۔۔ ذمہ داریاں تو اس کی بڑھ گئی تھیں بچوں میں الجھ کر وہ اور تنہا ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہتا اس کا شوہر اس سے باتیں کرے، دل جوئی کرے، اس سے کہے: ہاں! تم واقعی تھک جاتی ہوگی، تمھیں آرام چاہیے، لیکن بس خاموشی، گہری خاموشی والا تعلق اس کا مقدر بن گئی تھی! اسے جب یاد آتا کہ ثمن نے اپنے پہلے بیٹے کے بعد کہا تھا کہ ”تمہارے بہنوئی تو میرا پہلے سے بھی بہت خیال رکھنے لگے ہیں اور چھٹی والے دن تو بس کچھ وقت وہ بچوں کو اکیلے سنبھالتے ہیں، تاکہ میں اپنی نیند پوری کرلوں۔“ مریم نے ہنستے ہوئے سر ہلایا، ”ہاں! یہ مرد بڑے نرم دل ہوتے ہیں، لیکن بس انھیں احساس دلانا پڑتا ہے۔“ شیما نے مسکرا کر تائید کی، مگر اس کے اندر ٹوٹنے کی آواز کسی نے نہ سنی۔ وہ سوچ رہی تھی: ”میرے نصیب میں یہ نرمی کیوں نہیں؟ میں نے کہاں کمی کی؟ میں نے کہاں غلطی کی۔۔۔؟“

ایک دن وہ اپنی امی کے گھر گئی۔ امی نے اس کا چہرہ دیکھا تو ٹھٹک گئیں۔ ”سب ٹھیک ہے نا، بیٹا؟“ شیما نے لب کھولے، مگر لفظ باہر نہ آئے۔ صرف آنکھوں کے کنارے لرزے جیسے برسوں کی خاموشی پگھلنے کے لیے تیار ہو، لیکن لبوں پر مسکراہٹ سجا کر بس اتنا کہا: ”بس تھک گئی ہوں۔“ اسے یہ سبق بخوبی یاد تھا کہ ہم اپنے دُکھ کھولتے نہیں خود کو سپردِ تقدیر کر دیتے ہیں۔ گھر واپس آتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی، شاید میں ہی قسمت کی غلط شاخ پر رکھی گئی چڑیا ہوں۔ اس رات جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ جو اندر کہیں دیمک لگی تھی، وہ اب کافی پھیل چکی ہے۔ اتنی کہ اس کے دل کی مضبوط لکڑی اب آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگی تھی۔ اس نے آئینے میں خود کو دیکھا وہی چہرہ، وہی آنکھیں مگر وہ جو کبھی محبت پر یقین رکھتی تھی، جو

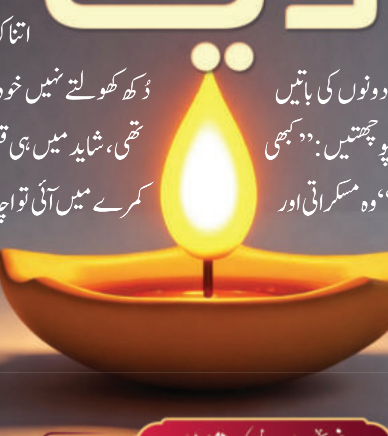

اپنے ہونے کی قدر جانتی تھی، وہ گم ہو چکی تھی۔۔۔ اس کی آنکھوں سے ایک آنسو لڑھکا، پھر دوسرا اور پھر اتنا روئی کہ اس کے بعد آنسوؤں نے بھی شاید آنکھوں میں آنا چھوڑ دیا کہ کہاں تک ساتھ نبھاتے؟

وقت گزرتا گیا۔ بچے بڑے ہوئے، سہیلیوں کے گھروں میں محبت کی کہانیاں اور گہری ہو گئیں۔ شیما کا دل مگر بنجر زمین تھا، جس پر کبھی بارش نہیں ہوئی۔ ایک دن اس نے شام میں اپنے شوہر کو دیکھا وہ اسی طرح ٹی وی اسکرین کے سامنے موبائل لیے بیٹھے تھے، جیسے گزشتہ کئی برسوں سے بیٹھتے ہیں۔ نہ اس نے کبھی پوچھا، نہ کبھی تلاش کیا، نہ کبھی ضرورت سمجھی کہ جانے اس کے اندر کیا ٹوٹتا رہا ہے۔ اس شام پہلی بار تھک کر اس نے خود سے کہا: "یہ شخص کبھی نہیں بدلے گا، میں اس کے انتظار میں برسوں سے کھڑی ہوں، لیکن یہاں تو وقت بھی رُک گیا اور محبت بھی مر گئی۔۔۔" چاندنی میں اس رات اس نے خود کو دیکھا، وہ لڑکی جو کبھی خوابوں والے گھر کی اُمید لے کر آئی تھی، وہ عورت جو برسوں سے دل میں دیمک کی طرح لگے درد سے لڑتی رہی، وہ ماں جو بچوں کے لیے مضبوط بنی رہی اور وہ انسان۔۔۔ جو صرف محبت کی طلب گار تھی اس کی آنکھوں سے برسوں بعد دو آنسو گرے۔ نہ واویلا، نہ شکوہ صرف خاموشی۔۔۔! اور اسی خاموشی میں اس نے جان لیا: محبت نہ رشتوں سے ملتی ہے، نہ وقت سے! یہ دل کے احساس سے ملتی ہے جو اگر کسی کے پاس ہو تو اسے دلانے کی ضرورت نہیں ہوتی اور جس کے پاس نہ ہو تو وہ برسوں میں بھی نہیں ملتا اور شیما کے حصے میں صرف انتظار تھا، محبت نہیں۔۔۔ اس لمحے اس کے پاس سے اس کا جوان ہوتا بیٹا گزرا تو اس نے بس خود سے عہد کیا کہ میں اپنے بیٹے کو کسی شیما کی زندگی بنجر کرنے نہیں دوں گی۔

اسی لمحے اسے لگا کہ اس کے دل کی بنجر زمین پر کہیں بہت دور ہلکی سی بوند گری ہے، کوئی بہت نرم، بہت خاموش سی امید! اور شاید یہی اُمید کسی بھی عورت کی زندگی میں محبت کا پہلا بیج ہوا کرتی ہے۔

بقیہ

محبت کی جیت

اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔

رابعہ کی شادی کو کوئی ایک سال ہو چکا تھا۔ یہ اس کے سسرال میں پہلی عید تھی اور تنویر بھی پہلی بار اس کے گھر جا رہا تھا۔

عمارت کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے حذیفہ نے تنویر کے ہاتھ سے مٹھائیوں کے ڈبے لے لیے اور دادا ابا بن کر آگے آگے چلنے لگا۔ سفید رنگ کے گیٹ کے باہر پہنچ کر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔۔۔ کوئی نہ تھا۔ وہ اُلجھن میں نیچے اترا تو دیکھا تنویر اور طلحہ نیچے والے فلور پر کالے رنگ کے گیٹ کے سامنے کھڑے ہیں۔ وہ بھی خاموشی سے ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ گھنٹی بجا دی گئی۔ چند ہی لمحوں میں دروازہ کھل گیا۔ سامنے۔۔۔ رابعہ کھڑی تھی۔

اس نے گلابی رنگ کا ٹو پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ قمیص گھٹنوں سے ذرا اوپر تھی اور ٹراؤزر ڈھیلا۔ بال اس نے کھلے چھوڑ رکھے تھے اور سر پر محض سرسری سا دوپٹہ رکھا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں انگوٹھیاں اور بریسلٹس تھیں، جو اس پر نہایت نفیس لگ رہی تھیں۔ دوپٹہ بار بار اس کے سر سے سرک جاتا اور وہ بیزاری سے اسے بار بار درست کرتی۔۔۔ بالکل عمیمہ کی طرح۔۔۔

"السلام علیکم، بھائی!" تنویر کو سامنے دیکھ کر رابعہ اس قدر حیران ہوئی کہ سلام کرنے کے بعد بس اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ اندر بلانا تو جیسے بھول ہی گئی ہو۔

"ارے بیٹا تنویر! اندر تو آؤ۔" پیچھے سے رابعہ کی ساس نے نرمی سے اسے جھنجھوڑا، تب جا کر وہ چونک کر آگے بڑھی اور تنویر کو اندر لے آئی۔

رابعہ نے حذیفہ اور طلحہ کو کھلے دل سے گلے لگا لیا۔ اس کے لمس میں ایسی اپنائیت تھی کہ تنویر کی آنکھیں بھر آئیں۔ نہ جانے اللہ تعالیٰ نے ماں کی ممتا کے بعد عورتوں کے دل میں بھائی کے بچوں کے لیے کیسی خاص محبت رکھ دی ہوتی ہے۔۔۔ ایسی محبت جو بنا کہے، خود بخود اُمڈ آتی ہے۔

"صبح ہوئی تو رابعہ شیر خورما بنانے کچن میں چلی گئی۔" رابعہ کی ساس نے تنویر کو ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے اس سے کہا کہ بیٹا، بس اپنے اور میرے لیے تھوڑا سا بنا لینا، کیوں کہ تمہارے سسر اور شوہر تو شیر خورما پیتے ہی نہیں۔" وہ تنویر کو صبح کی روداد سنا رہی تھیں۔

پہلے تو رابعہ کو حیرت ہوئی کہ عید کے دن کوئی شیر خورما کیسے نہیں پی سکتا، مگر بہر حال اس نے بنا ہی لیا۔ جب میں کچن میں گئی تو پتیلے میں اتنا زیادہ شیر خورما دیکھ کر میں نے پوچھا: "بیٹا، اتنا سارا کیوں بنا لیا؟"

وہ بولی: "میرے تنویر بھائی کو شیر خرما بہت پسند ہے، یہ ان ہی کے لیے بنایا ہے۔" یہ سن کر تنویر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

اتنی دیر میں رابعہ سب کے لیے پیالیوں میں شیر خورما لے آئی۔ طلحہ اور حذیفہ نے بھی شوق سے پیا۔

"یار۔۔۔ پھپھو تو امی سے بھی اچھا شیر خورما بناتی ہیں!" حذیفہ نے طلحہ کے کان میں سرگوشی کی۔

"ششش۔ امی کو مت بتانا، کہیں دوبارہ لڑائی نہ ہو جائے!" طلحہ نے فوراً اسے خاموش کروا دیا۔

تنویر نے بہن کو مٹھائی دی، ساتھ ہی عیدی بھی۔۔۔ پھر محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

رابعہ نے بھائی کو دعاؤں کے سائے میں رخصت کیا۔

"بھائی! آپ آئے۔۔۔ بہت اچھا لگا۔" رابعہ کے چہرے کی خوشی دیدنی تھی۔

"اب تم بھی میرے گھر آنا۔" یہ کہہ کر تنویر باہر نکل آیا۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے اسے محسوس ہو رہا تھا، جیسے اس نے کوئی بڑی فتح حاصل کر لی ہو۔ یہ مقابلہ کبھی اس کی بہن کے ساتھ تھا ہی نہیں۔۔۔ یہ جنگ تو اس کے اپنے اندر تھی۔۔۔ نفرت کے ساتھ، بغض کے ساتھ، غصے کے ساتھ۔ اور وہ جیت گیا تھا۔ میں جیت گیا ہوں، امی۔۔۔!

میں نے نفرت، انا، بغض اور عداوت۔۔۔ سب کو ہرا دیا ہے۔ اب دل ہلکا بھی ہے اور خوش بھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔۔۔ اور کہیں نہ کہیں، اس کی امی بھی اس کے ساتھ مسکرا رہی تھیں!

Get your Eid preps blooming!
Perfect
FRESHENER
ROOM FRESHENER
BLOOM
LA PERFUME
DRY 300 ml e
Perfect
FRESHENER
ProudlyMadeInPakistan

قرض دار

انیسہ عائش

"یہ لو یہ پیسے رکھ لو اور اپنی ضرورت پوری کرو۔ ان کی واپسی کے لیے پریشان نہ ہونا، جیسے سہولت اور آسانی ہو آرام سے لوٹا دینا۔" نسیمہ خاتون نے اسے پیسے تھمائے، جسے اس نے قیمتی متاع کی طرح مٹھی میں دبا لیا۔ دروازے میں کھڑی رفدا یہ منظر دیکھتی واپس پلٹ گئی۔ اس کے چہرے پر الجھن کے واضح آثار تھے۔

کشادہ ڈرائنگ روم کے نفیس سے صوفے پر ٹانگ پہ ٹانگ جمائے عینی میڈم براجمان تھیں۔ ان کی نظریں سامنے لگی ایل۔ سی۔ ڈی پر جمی تھیں۔ ڈرائے فروٹ کا باؤل ان کی گود میں دھرا تھا، جس میں سے وہ وقتاً فوقتاً ڈرائے فروٹس نکال کر کھا رہی تھیں۔ اسی اثنا میں ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور ڈرتی جھجکتی پینو سست روی سے چلتی ان کے پاس آکھڑی ہوئی۔ انھوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ "وہ۔۔۔ باجی جی! کچھ پیسے چاہیے تھے۔ منّا بیمار ہے۔ منّے کے ابا کی کئی دنوں سے دیہاڑی نہیں لگی تو۔۔۔"

"تو میں نے کیا خیراتی ادارہ کھول رکھا ہے؟" وہ تند لہجے میں گویا ہوئیں۔

"نہیں باجی جی! وہ مجھے ادھار ہی دے دیں۔" انھوں نے پاس پڑے پرس میں سے چند نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھائے۔ "یہ لو! تمھاری تنخواہ میں سے کاٹ لوں گی اور نہیں پورا پڑتا تو اپنے خرچے کم کرو۔" وہ نخوت سے کہہ کر ایل۔ سی۔ ڈی کی جانب متوجہ ہو گئیں، گویا اشارہ ہو اپنی شکل گم کرو۔ پینو ممنون سی پلٹ آئی۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی رفدا بولی: "مام! مے بی اسے ضرورت ہو؟"

"ارے بیٹا! تمھیں نہیں پتا ان باتوں کا۔ ایک بار دے دیں تو انھیں عادت پڑ جاتی ہے مانگنے کی، اس لیے منع کر دیا۔" وہ قریب رکھے کوچ پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظروں میں پینو کی صورت گھوم رہی تھی۔ اسے ماں کا رویہ کچھ ٹھیک نہیں لگا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ساری سوچوں کو جھٹکا اور سامنے لگی سکرین کی طرف متوجہ ہو گئی۔

رفدا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے بابا فطرتاً نیک مزاج، مہذب اور سلجھے ہوئے انسان تھے۔ اس کے برعکس اس کی ماں آزادانہ مزاج اور کھلے ذہن کی خاتون تھی۔ اس کے بابا گاؤں کے رہنے والے تھے، مگر شادی سے پہلے ہی عینی کے گھر والوں نے شہر میں رہائش کی شرط عائد کر دی تھی۔ یوں شادی ہوتے ہی وہ شہر میں عینی کے ڈیڈی کے گفٹ کیے ہوئے بنگلے میں شفٹ ہو گئے۔ عینی کو اپنا سسرال سخت ناپسند تھا۔ ان کے شوہر کبھی کبھی اپنے خاندان کی خبر گیری کرتے اور ملنے چلے جاتے۔ عینی کا ان سے رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ انھوں نے رفدا کو بھی اپنے ددھیال سے دور رکھا تھا۔ رفدا کو یاد نہیں تھا کہ وہ آخری بار کب گاؤں گئی تھی، شاید بچپن میں دو چار بار جبکہ ننھیال کا یہ معاملہ تھا کہ ہفتے، دو ہفتے بعد ممی وہاں پہنچی ہوتی تھیں۔ عینی نے اسے اپنی رَوِش میں ڈھالنے کی پوری کوشش کی تھی، مگر وہ اپنی شکل کے علاوہ مزاج میں اپنے والد کا پرتو تھی۔ اب بھی وہ او لیول کے امتحانات دے کر فارغ ہوئی تو اس کے من میں نا جانے کیا سمائی اپنے بابا کے ساتھ گاؤں چلی آئی۔ اس کی یہ ضد ممی کو سخت ناگوار گزری، مگر بابا ڈھال بن گئے۔ وہ گاؤں پہنچی تو سب نے خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔ اتنی محبت اور اپنائیت کا مظاہرہ گویا برسوں سے جانتے ہوں۔ اس کے سارے واہمے ہوا ہو گئے۔ سب سے زیادہ خوش اس کی دادی ہوئی تھیں۔ "ماشاءاللہ! کتنی بڑی ہو گئی ہے میری پوتی۔ میں تو ہر بار تمھارے ابا سے کہتی تھی کہ تمھیں ملانے لے آئے۔" انھوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر اسے اپنی محبت بھری آغوش میں سمو لیا۔ ان کی شفقت پر وہ سوچ رہی تھی کہ ممی ایسے ہی بدگمان رہتی ہیں دادی سے۔

یہ بڑی سی حویلی نما گھر تھا، جہاں اس کے دو چچا اور ان کے بچے سب مل جل کر رہتے تھے۔ اسے دو ہفتے ہونے کو آئے تھے۔ اس نے ایک بات نوٹ کی کہ اس کی دادی اماں بہت فیاض خاتون تھیں۔ ان کے ہاں سارا دن گاؤں کے مسکین، محتاج اور ضرورت مندوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ یہ چھوٹا سا گاؤں تھا، جہاں کے لوگوں کے حالات کی خبر رکھنا چنداں مشکل نہ تھا، سو خود چل کر آنے والوں کے علاوہ انھیں باقی لوگوں کا بھی خیال رہتا اور ان کی خاموشی سے مدد کر دیا کرتیں۔ اس کام میں دونوں چچا ان کے معاون تھے۔ اس کی ممی بھی کئی این جی اوز کو بھاری رقوم دیا کرتی تھی، مگر یہ طریقہ کار رفدا کو ان کی دکھلاوے کی ڈونیشن دینے سے بہت مختلف لگا تھا۔ ایک دن وہ دادی اماں سے پوچھ بیٹھی کہ وہ یہ سب کیوں کرتی ہیں تو انھوں نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور اپنے مخصوص نرم انداز میں سمجھایا اور احادیث بھی سنائیں۔

"بیٹی! حضور ﷺ کا فرمان ہے: جو مسلمان دوسرے مسلمان کی تکلیف اور پریشانی دور کر کے اسے خوش کر دے تو اللہ تعالیٰ اس خوش کرنے والے کو جنّت میں داخل فرمائیں گے۔" ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: جو اپنے بھائی کی حاجت میں مصروف ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی حاجت میں مصروف ہو جاتے ہیں اور جو کسی مسلمان کی پریشانی کو دور کرے گا، اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کی پریشانیوں میں سے ایک پریشانی کو دور فرما دے گا۔ (صحیح بخاری) رفدا یہ فضائل سن کر بہت متاثر ہوئی کیوں کہ وہ اپنی ممی کی زبان سے ان این جی اوز کو ڈونیشن دینے کے فائدے سنتی رہتی تھی، مگر ان میں سے ایک بھی بے غرض نہیں ہوتا تھا۔

وہ کمرے میں آئی تو دادی اماں کے پاس ایک خاتون کو بیٹھا پا کر پلٹنے ہی لگی تھی کہ اس کے کانوں میں سے دادی کی آواز ٹکرائی۔ "یہ لو، ابھی کے لیے یہ پیسے رکھ لو اور اپنی ضرورت پوری کرو۔ شام کو آنا باقی شام کو دے دوں گی اور پیسوں کی واپسی کے لیے پریشان مت ہونا،

بقیہ صفحہ نمبر 25 پر

ابو جی!

فاکہہ قمر

"یہ نالائق ہمیشہ ہماری ناک ہی کٹواتا ہے۔" بشیر صاحب ہاتھ میں رزلٹ پکڑے غصے سے بول رہے تھے۔

ہاشم کا آج پانچویں جماعت کا رزلٹ آیا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح بمشکل پاس ہی ہوا تھا جبکہ اس کے چچا کا بیٹا وقاص اوّل پوزیشن لے کر آیا تھا۔ آج کا دن ہاشم کے لیے بہت مشکل تھا۔ سب کی ڈانٹ اور لعن طعن سننا تو جیسے اس کی زندگی کا حصہ ہی بن گیا تھا۔

رات کا کھانا بھی ٹھیک سے سکون سے وہ سب نہیں کھا سکے تھے، جبکہ ساتھ والے گھر سے ہنسی اور قہقہے کی آوازیں گونج رہی تھیں جو ان کے زخموں پر نمک چھڑکنے کا کام کر رہی تھیں۔

ہاشم ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ تین بہنیں اور دو بھائی تھے۔ غریبی کی وجہ سے ہمیشہ وہ لوگ بے سکونی کا شکار رہے تھے۔ بشیر صاحب بڑی مشکل سے گھر کا خرچ چلا رہے تھے جبکہ ہاشم کی امی لوگوں کے گھروں میں کام کر کے بچوں کی تعلیم کا بوجھ اٹھا رہی تھیں۔

بشیر صاحب کو لگتا تھا کہ بچوں کو اسکول بھیجنا بڑی بے وقوفی ہے جبکہ ہاشم کی کارکردگی کو دیکھ کر ہر بار بشیر صاحب کا فیصلہ مزید اٹل ہو جاتا۔ بشیر صاحب کا مزاج بہت تیز اور زبان میں کڑواہٹ تھی، جس کی وجہ سے ہاشم کے دل میں باپ کے لیے نفرت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔

ہاشم کا دھیان پہلے ہی پڑھائی میں نہیں لگتا تھا اور اب تو وہ مزید اپنے باپ سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

آئے دن گھر کی لڑائی جھگڑے سے تنگ آ کر بشیر صاحب نے ہاشم کو اسکول سے اٹھا لیا اور سائیکل کی دکان پر ڈال دیا۔ ہاشم اب سارا دن دکان پر کام کرتا، مالک کی گالیاں کھاتا تو اسے اپنے باپ سے مزید نفرت محسوس ہوتی۔

وقت یوں ہی گزرتا گیا اور ایک دن ہاشم کی ملاقات ایک نفیس شخصیت کے مالک قاری شہباز سے ہوئی جو اس کی دکان پر اپنی موٹر سائیکل ٹھیک کروانے آئے تھے۔

ہاشم کو ان کا مزاج، عادت اور رویے نے بے حد متاثر کیا اور وہ ان سے پوچھنے لگا۔

"آپ کیا کرتے ہیں؟" قاری شہباز نے ہاشم کو مسکرا کر دیکھا اور بتایا۔

"میں عالم ہوں، بچوں کو قرآن پڑھاتا ہوں۔" ہاشم نے بچپن میں گلی کی مسجد سے ناظرہ قرآن پڑھنا شروع کیا تھا، لیکن پھر وہ بھاگ آیا تو اس کا قرآن مکمل نہ ہو سکا۔ آج قاری شہباز سے مل کر ایک بار پھر سے اس کا قرآن پڑھنے کا دل چاہا۔

"کیا میں۔۔۔؟" ہاشم نے ہمت کر کے کہا۔

"جی کیا؟" قاری شہبار نے مسکرا کر نرمی سے پوچھا تو ہاشم کو بہت ہمت ملی۔

"کیا میں بھی قرآن پڑھ سکتا ہوں؟" ہاشم نے اپنے دل کی خواہش کا اظہار کیا۔

"بالکل بیٹا! آپ بھی پڑھ سکتے ہو۔" قاری شہباز کا اتنا کہنا تھا کہ ہاشم کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔

"میں دن میں کیسے پڑھوں گا؟" ہاشم کو اچانک اپنی مصروفیات کا خیال آیا تو پریشان ہو گیا۔

"اس میں پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے، آپ رات میں عشاء کی نماز کے بعد آ جایا کرنا۔" قاری شہباز نے ہاشم کی پریشانی کو دور کرتے ہوئے کہا تو ہاشم کا دل ہلکا ہو گیا اور چہرے پر سکون چھا گیا۔

اگلے دن سے ہاشم نے جلدی جلدی کام کیا اور رات ہوتے ہی مسجد کی طرف چل پڑا، لیکن مسجد کے دروازے پر جا کر رُک گیا۔

ہاشم ایک عجیب سی کشمکش کا شکار تھا۔ تب ہی اچانک ایک بزرگ نے ہاشم کو مسجد کے دروازے پر دیکھا تو بڑے پیار سے کہا: "بیٹا آ جاؤ اندر، اتنا پریشان نہیں ہوتے۔" ہاشم جو پہلے قاری شہباز کی شخصیت سے متاثر تھا، اب وہ بزرگ کی بات پر دل سے مطمئن ہو گیا تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا یہ جگہ اچھے اور پیارے لوگوں کی ہے، جو صرف پیار اور محبت بانٹتے ہیں۔

اللہ کا نام لے کر ہاشم مسجد میں داخل ہو گیا۔ ایک طرف بچے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے تو ایک طرف کچھ لوگ نفل ادا کر رہے تھے جبکہ کچھ ہاتھ میں تسبیح پکڑے ذکر میں مصروف تھے۔ قاری شہباز نے پہلے دن ہاشم سے ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتیں کیں، تاکہ وہ اس ماحول میں خود کو اجنبی محسوس نہ کرے۔ پھر اسے مسجد میں داخل ہونے کے آداب بتائے، ساتھ ہی ساتھ وضو کرنا سکھایا اور پہلا، دوسرا کلمے بھی درست کروائے۔

ہاشم بہت ذہین تھا۔ اس نے بہت جلد بہت کچھ سیکھ لیا تھا اور اب وہ مسجد میں خود کو بہت پُر سکون محسوس کرتا تھا۔ دن گزرتے گئے اور ہاشم ناظرہ قرآن مکمل کر کے پہلا سپارہ شروع کر چکا تھا۔ آج بھی ہاشم جب اپنے وقت پر مسجد پہنچا تو دیکھا کہ وہاں بہت سے لوگ جمع ہیں، جیسے کوئی تقریب ہونے والی ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج ماہانہ درسِ قرآن ہے۔ سب بچے اور بڑے اپنی اپنی جگہ سنبھال کر بیٹھ گئے۔ قاری شہباز نے اپنی خوب صورت آواز میں قرآنِ مجید کی تلاوت کی پھر درس کا سلسلہ شروع ہوا۔

پیارے دوستو! اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا میں آپ کو جنّت ملے تو کبھی بھی اپنے والدین کے ساتھ بُرا سلوک مت کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اور تمہارے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔

اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انھیں اُف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑکو، بلکہ ان سے ادب کے ساتھ بات کرو اور محبت و رحمت کے ساتھ ان کے سامنے عاجزی کا بازو جھکائے رکھو اور دعا کرو: "اے میرے رب! ان پر رحم فرما جیسے انھوں نے بچپن میں مجھے پالا تھا۔" (اِلاسراء: 24-23)

"پیارے ساتھیو! اگر ماں کے قدموں تلے جنّت ہے تو والد بھی جنّت

کے دروازے کی چابی ہے۔'' ہاشم کو بے اختیار اپنے ابو یاد آئے، ان کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا، لیکن اس نے سر کو جھٹک دیا۔

قاری شہباز اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''اپنے باپ کی فرماں برداری کرو، جب تک وہ حیات ہیں اور کسی حال میں اُن کی نافرمانی نہ کرو۔'' أَطِعْ أَبَاكَ مَادَامَ حَيًّا وَلَا تَعْصِهِ (مسند احمد بن حنبل)

یہ الفاظ ہاشم کے دل و دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے، اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور ابو کے محنت کش مزدوری والے ہاتھ اور پھٹے پرانے کپڑے ذہن میں گھومنے لگے۔ درس کے اختتام پر دعا میں ہاشم بہت رویا اور اس نے اپنے والدین خاص کر اپنے ابو کی صحت و عافیت والی لمبی زندگی کی دعا کی۔ اس دن گھر واپس جاتے ہوئے ہاشم اپنے ابو کی پسند کا بسکٹ لے کر گھر گیا۔

''ابو جی! یہ میں آپ کے لیے لایا تھا۔'' ہاشم نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

ہاشم کے ہاتھ میں اپنا پسندیدہ بسکٹ دیکھ کر ابو دل ہی دل میں چھوٹے بچوں کی طرح مچل اُٹھے، لیکن بظاہر لاپروائی سے بولے۔

''ہاں! تو نے کون سا مجھ پر احسان کیا ہے؟'' ابو کی بات سن کر ہاشم کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے بسکٹ ابو کے بستر کے پاس رکھ دیا اور خود سونے چلا گیا۔

اس دن کے بعد سے اکثر ہاشم ابو کی پسند کی کوئی نہ کوئی چیز لاتا، لیکن وہ پہلے کی طرح ہی غصے کرتے۔ ہاشم کا دل بہت ٹوٹ جاتا، لیکن وہ پھر بھی کوشش جاری رکھتا۔ ایک دن ہاشم جلیبی لے کر گھر گیا، سب نے بہت شوق سے کھائی، لیکن ابو نے اس کو چکھا تک نہیں، ہاشم خاموش رہا۔

رات دیر گئے اچانک کروٹ بدلتے ہوئے ہاشم کی آنکھ کھلی تو سامنے کا منظر دیکھ کر پہلے وہ حیران ہوا، پھر بے اختیار مسکرا اُٹھا۔ رات دیر گئے وہ ہاشم کی لائی جلیبی کو تبرک سمجھ کر چوم کر کھا رہے تھے۔ بشیر صاحب کی ہمیشہ سے یہی خواہش تھی کہ ان کے بچے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں اور آج ہاشم کو کماتا دیکھ کر وہ بہت خوش تھے، لیکن اپنی محبت کا اظہار کر کے اس کو لاپروا نہیں بنانا چاہتے تھے۔ دوسری طرف ہاشم بھی ابو کو سمجھ گیا تھا اور پہلے سے زیادہ محبت کر رہا تھا۔

اب جب بھی ہاشم درسِ قرآن و حدیث میں والدین، رشتے داروں اور انسانی حقوق کے بارے میں کچھ جانتا تو ہمیشہ اپنی سوچ اور گناہوں پر معافی مانگتا اور گھر والوں کے ساتھ مل کر حالات بہتر بنانے کے لیے مزید کوشش کرنے لگا۔

بقیہ

قرض دار

جیسے آسانی اور سہولت ہو آرام سے واپس کر دینا۔'' وہ کمرے سے باہر نکل آئی، مگر اس کے ذہن میں وہ جملے ابھی بھی گونج رہے تھے۔ چند ایک خاتون پہلے بھی ان سے ایسے ہی رقم لے کر گئی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آئی تھی کہ دادی نے پیسوں کی واپسی کا کیوں کہا تھا اور پھر یہ بھی کہ جب آسانی ہو واپس کر دینا۔ وہ دادی اماں سے اس کی چچا زاد نے بتایا کہ یہ قرض مانگنے آئی تھی اور دادی اماں کے آسانی سے واپس کر دینا' کہنے سے وہ ان تھوڑے سے پیسوں کو سال میں جا کر واپس کرتی ہیں۔ شام کو دادی اماں کو اکیلا پا کر وہ ان کے پاس چلی آئی۔ وہ اس کے پُر سوچ تاثرات دیکھ کر بولیں: ''کیا ہوا بیٹی؟ کیا کچھ پوچھنا ہے تمھیں؟''

''دادی اماں! آپ باقی لوگوں کو بھی تو صدقات و خیرات دیتیں ہیں، ان عورتوں کو کیوں نہیں دیا؟'' رفدا نے پوچھا۔ اس کے سوال پر وہ مسکرا دیں۔ ''بیٹا یہ وہ سفید پوش عورتیں ہیں جو ہاتھ پھیلانا اچھا نہیں سمجھتیں نا کسی کو دیا ہوا لینا پسند کرتیں کہ اس سے ان کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے، مگر حالات کے آگے تنگ ہیں کہ کوئی نہ کوئی ایسا معاملہ ہو جاتا ہے کہ پیسوں یا مدد کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو ایسے لوگوں کو میں قرض دے دیتی ہوں، تاکہ ان کی خودداری قائم رہے اور محنت کی ترغیب بھی ملے۔'' یہ سن کر بے اختیار ہی رفدا کے منہ سے نکلا: ''اوہ۔۔۔ تو یہ بات ہے! مگر دادی اماں پھر آپ یہ کیوں کہتی ہیں جب آسانی ہو واپس کر دینا چاہے وہ واپس ہی نا کریں؟''

''بیٹا! وہ واپس نہیں کریں گی تو ان کا اپنا نقصان ہو گا کہ وہ مستقبل میں مدد کا ذریعہ کھو دیں گی۔ دوسرا وہ کم زور لوگ ہیں، میں جانتی ہوں کہ وہ یکمشت ادا نہیں کر سکتے، سو اپنی آسانی کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کر دیتے ہیں۔'' انھوں نے جواب دیا۔

''اس سب میں آپ کو تو کوئی فائدہ نہیں نا؟'' وہ پوچھ بیٹھی۔

''کیوں نہیں، فائدہ ہی فائدہ ہے۔ دیکھو بیٹا! مفہومِ حدیث ہے: صدقہ دینے کا اجر دس گنا ہے، جبکہ قرض دینے کا اجر اٹھارہ گنا ہے اور یہ بھی کہ قرض دار کو مہلت دینے والے کو قیامت کے دن عرش کا سایہ نصیب ہو گا۔۔۔ تو بھلا بتاؤ مجھے اتنا ثواب کمانے کا موقع مل رہا ہے اور قیامت کے دن جب اتنی مشکل صورتِ حال ہو گی، اس وقت عرش کا سایہ نصیب ہونا کتنی خوش قسمتی کی بات ہے۔''

''واقعی دادی اماں! یہ فائدے کی بات ہے۔'' رفدا اٹھی اور تھوڑی دیر بعد واپس لوٹی تو اس کے ہاتھ میں نوٹوں کی کئی گڈیاں تھیں، جنہیں وہ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی: ''جب شام کو وہ آئے تو آپ اسے یہ دے دینا۔ مما نے مجھے خرچ کے لیے دیے تھے، مگر یہاں آکر مجھے ضرورت ہی نہیں پڑی۔'' دادی نے تذبذب میں اسے دیکھا۔ ''بیٹا! آپ رہنے دو، یہ اپنے پاس رکھو۔'' وہ بولیں۔

''کیوں دادی اماں! آپ اکیلے اکیلے ہی سارا ثواب کمانا چاہتی ہیں؟ میں آپ کی پارٹنر نہیں بن سکتی کیا؟'' اس کے شرارت بھرے لہجے میں کہنے پر وہ مسکرا دیں۔ انھوں نے پیار سے اسے گلے لگا لیا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ بھلے سے بہو نے ان کی پوتی کو دور رکھا تھا، مگر تربیت اچھی کی ہے۔ ان کے دل میں اپنی بہو کے لیے گلے شکوے ختم ہو گئے تھے۔ دوسری طرف رفدا سوچ رہی تھی کہ وہ اپنی مما کو جا کر بتائے گی کہ دادی اماں کتنی اچھی ہیں اور ان کے درمیان دوریاں ختم کرے گی۔ ساتھ ہی اس نے عزم کیا کہ اس نے جو سبق دادی اماں سے سیکھے تھے، ان پر ضرور عمل پیرا ہو گی۔

عالمی ادارہ

بیت السلام

ویلفیئر ٹرسٹ

BAITUSSALAM

2200+

یتیم بچے زیرِ کفالت

رہائش، خوراک، تعلیم و تربیت

Saiban

FOR ORPHANS

BAITUSSALAM

پیمانہ

علیہ ذوالقرنین

شہر میں حالات عام دنوں جیسے تھے، مگر ہر گلی میں صرف ایک جملہ سنائی دیتا تھا "آج تمہارا پانی کا اسکور کتنا ہے؟" یہ ایک خاص شہر تھا، جہاں پانی کرنسی سے نہیں معاملات کی درستی کی جانچ پر ملتا تھا۔ حکومت نے برسوں پہلے اعلان کیا تھا "نظام بدل دیا گیا ہے، صاف پانی کی فراہمی صرف ان کے لیے ممکن ہوگی جو اپنی زندگی دیانت داری سے گزارتے ہیں۔" چناں چہ اب ہر شخص کے اعمال، رویوں اور امانت داری کو ایک اخلاقی انڈیکس میں ناپا جاتا تھا جو جتنا سچا، اتنا تر اور جو جتنا جھوٹا، اتنا پیاسا۔ بازاروں میں لوگوں کی باتیں اب قیمتوں پر نہیں بلکہ پوائنٹس پر ہوتیں۔ سلیم کا ایمان داری انڈیکس 95 رہتا ہے، اس کے گھر کی دونوں ٹینکیاں ہمیشہ بھری رہتی ہیں اور سمیرا۔۔۔؟ اس نے کل غلط رسید بنائی تھی، اب اس کے نل میں صرف آدھا پریشر ہے۔"

احمد نے دفتر کے لیے تیار ہوتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی آٹھ بجنے والے تھے اور اس کی بیوی نے بتایا تھا کہ صبح کے پوائنٹس اپڈیٹ ہو گئے ہیں۔

کل اس نے دفتر میں جھوٹ بولا تھا کہ رپورٹ وقت پر مکمل ہو گئی ہے اور اسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا تھا۔ آج صبح جب نل کھلا تو پانی کچھ بدلا ہوا سا تھا۔ نہ وہ چمک، نہ وہ خوشبو، مٹیالا سا پانی۔۔۔ اس نے آہستہ سے نل بند کر دیا، پیچھے مڑ کر دیکھا تو نائلہ دروازے پر کھڑی تھی۔ " پانی کے رنگ میں کیوں فرق ہے؟" ریاض نے بات ٹالنے کے لیے کندھے اچکائے۔

"شاید مرکزی لائن میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔"

"خرابی۔۔۔؟ مگر کیوں! ہم نے تو اپنے کام ٹھیک کیے تھے، بجلی کا بل وقت پر دیا، چندہ بھی جمع کرایا، پھر پانی کیوں بدلا؟"

"مجھ سے غلطی ہوئی تھی، کل ایک چھوٹا سا جھوٹ بولا تھا۔" احمد نے شرمندگی سے سر جھکائے ہوئے کہا۔

اگلے دن جب احمد دفتر پہنچا تو حسبِ معمول سب کے چہرے بے رونق تھے۔ سب کسی نہ کسی سوچ میں گم تھے۔

"تمہارے ہاں بھی پانی بدلا ہوا ہے؟" عارف نے پوچھا۔

احمد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پتا نہیں مجھ سے کہاں گڑبڑ ہوئی ہے، کل میرا انڈیکس 87 تھا، پھر بھی پانی میں نمک کا سا ذائقہ ہے۔" کمرے کے کونے میں صفیہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کے شوہر کا کل حادثہ ہوا تھا۔

"وہ مرنے سے پہلے بار بار کہہ رہا تھا، میں نے کسی کا حق نہیں مارا، پھر میرے گھر کے پانی کا رنگ کیوں بدل گیا؟"

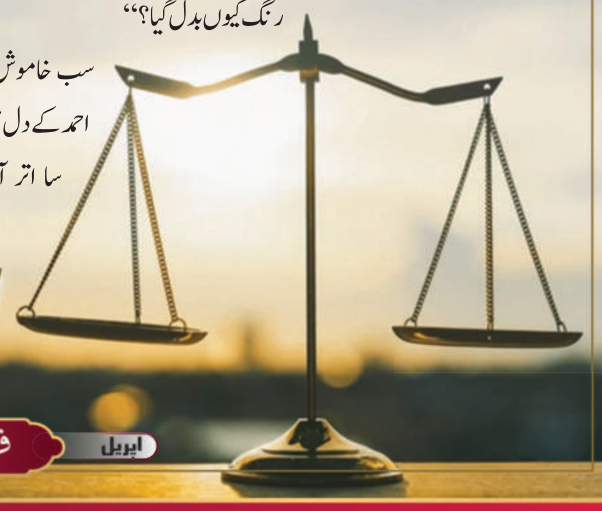

سب خاموش ہو گئے۔ احمد کے دل میں خوف سا اتر آیا۔ کیا یہ سسٹم واقعی انصاف پر چل رہا ہے یا اس میں بھی کوئی خامی ہے؟ دوپہر میں جب وہ واپس گھر لوٹا تو نائلہ نے دروازہ کھولتے ہی کہا: "احمد! تمہارا اکاؤنٹ دوبارہ اپڈیٹ ہوا ہے۔"

"کیا۔۔۔؟" وہ بوکھلا گیا۔

"انڈیکس ساٹھ پر آ گیا ہے اور پانی کا رنگ اور بھورا ہو گیا ہے۔" احمد نے گھبرا کر نل کھولا پانی کی بو تیز ہونے کے ساتھ رنگ بھی گہرا ہو چکا تھا۔

"ممکن ہے کسی نے تم پر جھوٹا کیس ڈال دیا ہو۔" نائلہ نے کہا۔ "یہاں سب کا ڈیٹا مرکزی سرور سے جڑتا ہے۔"

احمد کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ آج ہی اس نے دفتر میں باس کی غلطی چھپائی تھی، تاکہ پروجیکٹ وقت پر مکمل دکھایا جا سکے۔ کیا اخلاقی انڈیکس محض نیت سے جانچتا ہے یا عمل سے بھی؟ اس نے دل ہی دل میں سوال کیا، مگر جواب کہیں سے نہیں آیا۔ شام ہونے تک پورے محلے میں شور مچ جاتا تھا۔ کچھ گھروں میں مٹیالا پانی آتا تھا تو کچھ میں بالکل سیاہ۔۔۔ بچے پیاس سے پریشان ہوتے تھے۔ مرد اور عورتیں خالی بالٹیاں لیے گھروں سے صاف پانی بھرتے پھرتے۔ آج آسمان پر بادل چھائے تھے، مگر بارش نہیں ہو رہی تھی، جیسے اوپر بھی کوئی اخلاقی انڈیکس بیٹھا سب کو پرکھ رہا ہو۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے احمد نے دوبارہ پانی کا نل کھولا تو پانی ویسا ہی گدلا تھا۔ نائلہ اور بچے سو چکے تھے، لیکن احمد کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں بس ایک سوال گردش کر رہا تھا "یہ سب کیسے ہو رہا ہے؟" وہ شہر کی سڑکوں پر بائیک دوڑانے لگا۔ گلیاں ویران تھیں، مگر ہر گلی کے موڑ پر ایک چھوٹا سا بلیک باکس لگا تھا، جس پر سبز بتی جھلملا رہی تھی۔ یہ وہی "ایمان داری سینسر" تھے، جن کے بارے میں حکومت نے کبھی بتایا نہیں تھا کہ ان کے پیچھے کون ہے؟ راستے کے آخری موڑ پر ایک پرانا سب اسٹیشن تھا۔

بورڈ پر لکھا تھا "مرکزی آبی کنٹرول۔۔۔ عام داخلہ ممنوع"، مگر دروازے پر کوئی گارڈ نہیں تھا۔ دروازہ نیم وا تھا، جیسے کوئی جلدی میں بند کرنا بھول گیا ہو۔ اندر داخل ہوتے ہی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا۔ کمرے میں سینکڑوں شیشے کے سلنڈر تھے۔ ہر ایک پر کسی شہری کا نام کندہ تھا اور ان میں مختلف رنگوں کا پانی بھرا تھا: نیلا، شفاف، مٹیالا، کالا۔ ایک کونے میں کمپیوٹر اسکرین پر احمد بن خالد۔۔۔ انڈیکس: 60

اور نیچے لکھا تھا: "جھوٹ × 1، امانت × 0، نیت: متزلزل"

احمد کے بدن میں سرد لہر دوڑ گئی۔ اس نے آس پاس دیکھا، ایک اور شیشی میں "صفیہ" کا نام تھا، پانی بالکل گدلا۔ پھر "عارف"، اس کے سلنڈر میں نمک جمتا جا رہا تھا۔ تب اسے محسوس ہوا کہ یہ پانی ہی انسانوں کو جانچ رہا ہے۔ ہر عمل، ہر سوچ، حتیٰ کہ نیت بھی۔۔۔ قطرے اس کی حقیقت جان لیتے ہیں اور رنگ بدل لیتے ہیں۔ احمد نے چیخنے کی کوشش کی مگر چیخ نہ سکا، اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے کمپیوٹر کی اسکرین پر اپنی فائل کھولی۔

"احمد بن خالد۔۔۔ انڈیکس: 60۔ وجہ: جھوٹ برائے فائدہ، نیت مشکوک، رپورٹ غیر تصدیق شدہ۔"

بقیہ صفحہ نمبر 29 پر

سادہ سی سلطنت

ام محمد سلمان

یہ ہماری خالدہ بھی نا۔۔۔ بس عجیب ہی طبیعت کی مالک ہے۔ مزاج ایسا کہ کوئی کل سیدھی نہیں! اور باتیں ایسی کہ زمانے بھر سے نرالی۔ کل مجھ سے کہنے لگی: ”تمھیں پتا ہے سیما! میں اگر امیر ہو گئی نا اور میرے پاس ڈھیر ساری دولت آگئی تو میں سب سے پہلے کیا کروں گی؟“ اس کے لہجے میں شوق اور جوش کی آمیزش تھی۔

میں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کہا: ”جی جناب مجھے پتا ہے آپ کیا کریں گی؟“

”ہیں بھئی۔۔۔ تمھیں کیسے پتا؟ کیا میں نے تمھیں اس بارے میں کبھی کچھ بتایا ہے؟“

”ہاں، بتایا تو نہیں ہے، لیکن مجھے اندازہ تو ہے نا کہ تم دولت مند ہو جانے کے بعد کیا کرو گی؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا، چلو بتاؤ! میں کیا کروں گی؟“

”بھئی، سب سے پہلے تو تم اس چھوٹے سے علاقے سے نکل کر کسی پوش علاقے میں گھر خریدو گی، جس میں بڑا سا لان ہو، گھر جدید طریقے پر آراستہ پیراستہ ہو، قیمتی اور نفیس پردے اور قالینوں سے سجا ہو۔“

تمھارے باورچی خانے میں دال سبزی کی جگہ ہر روز نت نئے مزیدار اور مرغن کھانے پکا کریں گے۔ آئے دن ہوٹلنگ کرو گی، کبھی کسی ریسٹورنٹ میں کبھی کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا کھانے جاؤ گی۔ بڑی سی گاڑی میں شاپنگ کرنے جاؤ گی۔ برانڈڈ کپڑے خریدو گی، کسی بہترین ٹیلر سے سلواؤ گی، پھر پہن کر خوب خوب اتراؤ گی۔۔۔ آخری جملہ میں نے ہنستے ہوئے اور بہت مزے لے کر کہا جس پر وہ خود بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

کچھ دیر ہم دونوں سہیلیاں یوں ہی ہنستی رہیں، پھر خالدہ بڑی محبت سے میرا ہاتھ تھام کر بولی۔۔۔ اب میں تمھیں اپنے دل کی بتاؤں؟ میں امیر ہونے کے بعد کیا کروں گی؟

”بتاؤ!“ میں نے بھی دوسرے ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے بڑے پیار سے پوچھا اور اس کا ایک ناقدانہ جائزہ لیا۔۔۔ زعفرانی رنگ کا سوتی جوڑا پہنے، سر کے بالوں کی ہلکی سی چوٹی باندھے، سرمگیں آنکھیں، چمکتے دانت اور میک اپ سے مبرا چہرہ، وہ ایک عجیب سا نکھار لیے ہوئے تھی۔ میرے اندر رشک اور حسد کا ایک ملا جلا سا تاثر ابھرا۔۔۔ کم بخت اس سادہ سے حلیے میں بھی کتنی پیاری اور پُر وقار لگتی ہے۔ مگر پھر فوراً ہی میں نے ماشاءاللہ کہا اور دل میں اسے ہمیشہ شاد آباد رہنے کی دعا دی۔

”ارے کس سوچ میں پڑ گئیں سیما؟ میری بات سنو نا۔۔۔!!“ اس نے میرا کندھا ہلایا۔

”ہاں بھئی! سن تو رہی ہوں، بولو بولو۔“ میں نے اپنا اشتیاق ظاہر کیا۔

”پتا ہے، جب میرے پاس بہت سارے پیسے آئیں گے نا تو میں سب سے پہلے اس کوکنگ آئل سے جان چھڑا کے دیسی گھی خریدوں گی اور اس میں کھانے پکایا کروں گی!“ وہ آگے بھی کچھ کہہ رہی تھی، مگر مجھ پر حیرتوں کے ایسے پہاڑ ٹوٹے کہ اسے بیچ میں ہی روک دیا۔

”ہائیں ہیں۔۔۔ یہ کیا عجیب بات کر دی تم نے؟ بی بی ہوش میں تو ہو؟ تمھارے پاس دولت آئی تو تم سب سے پہلے دیسی گھی خریدو گی؟ کیا میرے کانوں نے ٹھیک سنا؟“ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو چھوا۔

”ہاں بھئی! تمھارے کانوں نے بالکل ٹھیک سنا!! میں سب سے پہلے دیسی گھی خریدوں گی اور وہ بھی بالکل اصلی والا دیسی گھی۔۔۔ ہر قسم کی ملاوٹ اور مصنوعیت سے پاک! میں اس گھی میں کھانے اور صبح ناشتے میں پراٹھے پکایا کروں گی ان شاءاللہ!“ اس نے مزے لے کر کہا۔

”اچھا بھئی! آگے۔۔۔“ میں نے پاؤں پھیلائے، تکیے سے کمر ٹکائی اور بڑی فیاضی سے اسے اپنی بات جاری رکھنے کی دعوت دی۔

”بھئی، میں سب سے پہلے اپنے کھانے پینے کی چیزوں میں معیاری پن لے کر آؤں گی۔ جان ہے تو جہان ہے! اس لیے صحت پر کوئی سمجھوتا نہیں۔ یہ طرح طرح کے کوکنگ آئل، بناسپتی گھی، برائیلر چکن، ڈبوں کے دودھ۔۔۔ یہ سب صحت کے لیے انتہائی نقصان دہ ہیں۔ مگر کیا کریں! ہم اپنی محدود آمدنی میں یہی سب کچھ کھانے پر مجبور ہیں۔ اسی لیے میں سوچتی ہوں، جب کبھی اللہ تعالیٰ نے مجھے اس قابل کیا نا تو میں اپنے گھر میں ان سب چیزوں کا داخلہ بند کر دوں گی۔ دیسی گھی میں کھانے پکایا کروں گی، فارمی مرغی اور انڈوں کی جگہ دیسی مرغی اور انڈے استعمال کروں گی۔ ایک گائے اور دو تین بکریاں بھی خریدوں گی اور وہاں پیپل کے درخت کے نیچے کھونٹا گاڑ کے باندھ دوں گی۔ اس نے اپنے بڑے سے کھلے صحن کے مشرقی کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اس کی دیکھ بھال اور دودھ وغیرہ دوہنے کے لیے ایک ملازمہ رکھ لوں گی۔ اپنی گائے اور بکری کے لیے بھی بہت اچھی عمدہ کوالٹی کا چارہ خریدوں گی، تاکہ ان کا دودھ بھی اچھا اور خالص ہو۔ بتاؤ ذرا۔۔۔ زندگی کتنی خوب صورت ہو گی، جب گھر کا دودھ، گھر کا خالص مکھن، دیسی گھی اور دیسی انڈے دستیاب ہوں گے۔ میرا شوہر اور بچے صبح ناشتے میں دیسی انڈے کھا کر جان بنائیں گے اور جب کبھی مرغی کا گوشت کھانے کو دل چاہا تو ہم اپنے گھر کی پالتو مرغیوں میں سے ایک ذبح کر کے مزیدار سالن بلکہ ثرید بنا کر کھائیں گے۔ واللہ کتنا مزہ آئے گا۔۔۔ افففف، میرے تو منہ میں پانی بھر آیا۔“ خالدہ نے مزے لیتے ہوئے کہا اور میں بس اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

اور پتا ہے، ایک اچھا سا گرائنڈر خریدوں گی اور بازار سے ہمیشہ اچھی کوالٹی کے ثابت مسالے لا کر خود ہی گھر میں پیس لیا کروں گی۔

مجھے اس کی سادہ اور معصوم سی خواہشیں اور باتیں اچھی لگ رہی تھیں، لہٰذا اپنے شوق اور اشتیاق کو مزید ظاہر کیا۔۔ اور بھئی اور۔۔۔ اس کے بعد؟

بس بھئی اس کے بعد کیا۔! بات ختم پیسا ہضم۔! باقی مزے جنّت میں کریں گے، ان شاءاللہ! وہ اٹھلائی۔

بھئی واہ خالدہ! تم دنیا کی عجیب ترین عورت ہو جس کے پاس دولت آئے گی تو وہ بجائے

گاڑی، بنگلے خریدنے کے دیسی گھی اور گائے بکریاں خریدے گی۔ ہاہاہا میں نے ایک مصنوعی قہقہہ لگایا۔ مگر وہ سچ مچ ہنس پڑی اور بولی... بھئی ہاں نا سیما!! میں یہی کروں گی ان شاء اللہ! مجھے گاڑی بنگلوں اور بہت اونچے معیارِ زندگی کی چاہ نہیں ہے۔ میں تو بس ایک سیدھی سادی سی تصنع، بناوٹ اور خواہ مخواہ کی نمائش سے پاک زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ فطرت اور قدرت کے قریب رہ کر زندگی کا لطف لینا چاہتی ہوں۔ پتا ہے سیما! مجھے کبھی خیال ہی نہیں آتا کہ دولت ملی تو بڑا گھر اور گاڑی خریدوں گی، بلکہ میرا تو جی چاہتا ہے میری زندگی میں سب کچھ خالص ہو، صحت بخش ہو، قدرتی ہو۔ میں آج کل کی اس مصنوعی زندگی اور دکھاوے سے سخت نالاں ہوں۔ میں تو بس اپنے نبی پاک ﷺ کے طریقے پر عمل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ زندگی سادہ ہو اور فطرت کے قریب ترین ہو، تھوڑا ہو مگر خالص اور طیب ہو اور بس۔۔۔!! اس نے ایک گہری سانس لی اور میری طرف دیکھا جیسے مجھ سے تائید چاہ رہی ہو۔۔۔! اور میرے پاس اس کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ ہائے میری عزیز سہیلی، میری خالدہ۔۔۔! میرے دل نے بڑی شدّت سے چاہا اللہ تعالیٰ اس کی ان سادہ اور معصوم سی خواہشات کو من و عن پورا کر دے۔ آمین

بقیہ

پیمانہ

احمد کی انگلیاں ماؤس پر رُک گئیں۔ ساتھ ہی ایک کالم کھلا "درخواست برائے نظرِ ثانی۔"

اس نے فوراً کلک کیا۔ اسکرین پر پیغام آیا: "نظرِ ثانی صرف ایڈمن کے دستخط سے ممکن ہے۔

ایڈمن: یونٹ 07- سٹی نارتھ۔" احمد کے قدم خود بخود اگلے دروازے کی طرف بڑھے۔

دھندلے کمرے میں ایک میز تھی، جس کے پیچھے درمیانی عمر کا شخص بیٹھا تھا۔

چہرہ تھکا ہوا، مگر آنکھوں میں ایک عجیب سکون۔

"کوئی دروازے پر نہیں تھا تو میں اندر آ گیا۔۔۔ میں اپنا انڈیکس چیک کر رہا تھا، شاید کوئی غلطی ہوئی ہے۔ میں نے کوئی بڑا جھوٹ نہیں بولا، صرف ایک رپورٹ وقت پر نہ دینے کا مسئلہ تھا۔" احمد نے جلدی جلدی کہا۔

مرد نے فائل بند کی اور بغیر اوپر دیکھے بولا: "سسٹم غلطی نہیں کرتا۔"

"لیکن میں نے کسی کا نقصان نہیں کیا!"

"سسٹم نقصان نہیں دیکھتا، رویہ دیکھتا ہے۔"

"اگر کوئی مجبوری ہو؟"

"سسٹم مجبوری نہیں سمجھتا، صرف سچ یا جھوٹ سمجھتا ہے۔"

احمد کچھ لمحے چپ کھڑا رہا، پھر بولا: "میں اسے دوبارہ درست کرنے کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" ایڈمن نے پہلی بار سر اٹھایا۔

"دو دن تک تمہارا انڈیکس فریز رہے گا۔ اگر تم نے اپنے تمام وعدے پورے کیے، ریکارڈ صاف رکھا، کسی کو دھوکہ نہ دیا تو صاف پانی واپس آ جائے گا۔"

"اور اگر نہ آیا؟"

"تو سمجھ جانا، تمہاری نیت اب بھی مشکوک ہے۔"

احمد نے آہستہ سر ہلایا اور پلٹنے لگا۔ دروازے کے قریب پہنچا تو پیچھے سے آواز آئی: "تم لوگوں کو ہمیشہ یہ مسئلہ رہتا ہے، تم سچ بولتے وقت بھی فائدہ ڈھونڈتے ہو۔ اسی لیے تمہارا پانی ٹیالا ہو جاتا ہے۔" احمد ٹھٹھک کر رُکا، مگر کچھ بول نہ سکا۔

احمد نے ریکارڈ روم میں داخل ہو کر آخری بار اپنی فائل پر نظر ڈالی جواب بھی ساٹھ پر اٹکا ہوا تھا، نیچے سُرخ نوٹ چمک رہا تھا: "نیت: مشکوک" اس کے اندر کچھ ٹوٹ گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ کی بورڈ کے نیچے ایک چھوٹی سی چابی تھی، جس پر لکھا تھا "Reset Water Logic" احمد نے ہچکچاتے ہوئے وہ بٹن دبا دیا۔

اسکرین پر پیغام آیا: "اخلاقی فلٹر غیر فعال۔۔۔ شہر کو براہِ راست پانی کی فراہمی بحال کی جا رہی ہے۔"

احمد کے دل کی دھڑکن رُک سی گئی۔ اگلے ہی لمحے پورے کمرے میں الارم بجا "سسٹم ریبوٹ ہو رہا ہے۔۔۔ ڈیٹا مٹا دیا گیا۔" اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا سلنڈرز کے رنگ ایک ایک کر کے بدلنے لگے۔ کالا، بھورا، مٹیالا، سب ایک ہو گئے اور پھر شفاف، بالکل بے رنگ۔ احمد دروازے سے باہر بھاگا۔ شہر کے نلوں میں پانی آ رہا تھا صاف، ٹھنڈا، بے عیب۔ شہر میں گویا رات کے آخری پہر جشن کا ساماں ہو گیا تھا، مگر احمد کے دل میں ایک عجیب سا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ پانی اب کسی کے عمل سے نہیں جڑا، یہ اس کے سسٹم خراب کر دینے سے آنے والا پانی ہے۔

اگلے دن دفتر میں سب مسکرا رہے تھے، گلیوں میں شور تھا، بچے کھیل رہے تھے، مگر احمد کا دل بوجھل تھا۔ پہلے لوگ کوئی بات کرنے سے پہلے سوچتے تھے "کہیں انڈیکس نہ گر جائے" اب کسی کو پروا نہیں تھی۔ سسٹم میں خرابی لانے کے بعد احمد کئی دن تک "اب کیا ہوگا" کے خوف میں مبتلا رہا، مگر پھر رفتہ رفتہ بھول بھال گیا، مگر شہر کا نقشہ بدلنے لگا تھا۔ اب گلیوں میں پانی کی بات نہیں ہوتی تھی، لوگ پھر سے جھوٹ بولنے، فراڈ کرنے اور دھوکے دینے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں لگے تھے، لیکن نلوں سے صاف پانی آ رہا تھا۔ احمد کبھی سوچتا، کیا واقعی انسانوں کو نیکی سے زیادہ پانی کی ضرورت تھی؟ یا وہ صرف سزا کے خوف سے اچھے بنے تھے؟

آج کل اس کا بیٹا، حسان! بار بار بیمار ہونے لگا تھا۔ بخار اترتا تو سانسیں تیز ہو جاتیں۔ نائلہ نے کئی ڈاکٹروں کے چکر لگائے مگر فرق نہ پڑا۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا جو بھی بیمار ہوتا ایک ہی ڈاکٹر کی دوا کھا کر ایک دو دن میں ٹھیک ہو جاتا۔ پانچویں دن احمد بیٹے کو ہسپتال لے کر گیا، گھر پہنچتے ہی اس نے حسان کو دوا پلائی۔ رات گئے اچانک نائلہ کی چیخ سنائی دی۔ احمد بھاگتا ہوا اندر آیا، بیٹے کے ہونٹ نیلے پڑ چکے تھے۔ جعلی دوائی بیٹے کی جان لے چکی تھی۔ احمد کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ نلکوں میں شفاف پانی اب بھی تھا، مگر سزا کا خوف ختم ہونے سے انسانیت گدلی ہو چکی تھی۔

بند الماری

ساجدہ بتول

''پیاری بہنا! میری کتابیں تو بکوا دو۔ بچوں کی کہانیوں کی کتابیں ہیں۔'' آپی ناجیہ شعیب کی طرف سے یہ میسج موصول ہوا تو یاد کے پردے پہ کئی خوب صورت عکس جھلملانے لگے، لیکن اس خوب صورتی پہ کچھ گہن لگا محسوس ہوا تو میں اس کو کھوجنے بیٹھ گئی۔

یہ ایک پرائمری اسکول تھا۔ایک سرکاری اسکول۔۔۔ جس کی دیواریں آج کے ماضی کی سادہ مٹی اور اینٹوں سے چُنی گئی تھیں۔ جہاں کسی بھی قسم کے کیمرے، موبائل، لیپ ٹاپ، ٹیب، ٹی وی اور پی ٹی سی ایل نہیں تھا، جس میں یکسوئی ہی یکسوئی ہے! آپ مزے سے کھیل سکتے ہیں۔مزے سے پڑھ سکتے ہیں اور مزے سے گپ شپ لگا سکتے ہیں۔کوئی اسکرین مخل نہیں ہوتی! اُس اسکول میں ایک ہی بڑا سا کمرہ تھا اور کمرے کے آگے برآمدہ جس کا فرش کہیں کہیں سے اُکھڑ گیا تھا۔

اسکول میں چھ کلاسیں لگتی تھیں۔ کچی، پکی، دوم، سوم، چہارم اور پنجم۔ ترقّی نامی بلا ابھی آئی نہیں تھی اور اُس نے کچی، پکی، دوم، سوم، چہارم اور پنجم کو نہیں کھایا تھا، للہٰذا ان کی جگہ لینے کے لیے ابھی یہاں وَن، ٹو، تھری، فور اور فائیو نہ آسکی تھیں۔ خال خال مائیں ہی ملازمت کرتی تھیں، للہٰذا ان کی مدد کرنے کو پلے گروپ نامی ماں ابھی ایجاد نہ ہوئی تھی اور اگر کہیں پہ ہوئی بھی تھی تو یہ سرکاری اسکول اس سے محفوظ تھا۔ کچی کلاس کچے صحن میں لگتی تھی، پکی کلاس برآمدے کے پکے فرش پہ اور بقیہ چار عدد کلاسز کمرے میں پائی جاتیں، جو اپنے مرتبے کے لحاظ سے آگے پیچھے بیٹھی ہوتیں۔اسکول میں دو ہی استانیاں تھیں۔ چھوٹی مس چھوٹی تین کلاسز کو پڑھاتی تھیں اور بڑی مس بڑی تین کلاسز کو۔

میں اس وقت جماعت پنجم میں تھی۔اب ذرا میری سوچ کا بیک گراونڈ بھی جان لیجیے۔

میں کہانیوں کی شیدائی تھی۔بچوں کے رسائل مجھے بے حد پسند ہوتے، لیکن ہمارا گھر گاؤں میں تھا۔گاؤں سے آگے قصبہ تھا۔قصبے کے آگے بالترتیب دو تین اور قصبے۔اس کے بعد ہی شہر شروع ہوتا اور شہر کے بھی درمیان میں دو بازار تھے، دونوں میں ایک ایک بک اسٹال ایسا پایا جاتا، جہاں سے ماہنامہ تعلیم و تربیت ملتا تھا۔

بچوں کے رسائل میں سے ہماری شناسائی صرف تعلیم و تربیت سے تھی۔ جب مہینے کی یکم ہوتی تو میں بھائی کی مِنّتیں شروع کر دیتی کہ تعلیم و تربیت لا دو۔

پھر وہ کسی دن تعلیم و تربیت لینے کے لیے شہر جاتا اور میں سارا دن انتظار میں بولائی بولائی پھرتی۔ کبھی گلی میں نکل کر اُس کی راہ دیکھتی۔ کبھی چھت پہ چڑھ کر دیکھتی۔ بِالآخر وہ اور تعلیم و تربیت شام کو آتے اور وہ شام، شام چراغاں ہو جاتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بھائی اکیلا آتا۔ تعلیم و تربیت اس کے ساتھ نہ آتا کیوں کہ وہ کسی بھی بک اسٹال پہ ملا نہ ہوتا اور مجھے ایسا صدمہ ہوتا، گویا کوئی پیارا بچھڑ گیا!

اب ہم تعلیم و تربیت میں سے نکل کر جماعت پنجم میں واپس چلتے ہیں۔

ایک دن جبکہ پڑھائی زور و شور سے جاری تھی۔ چھوٹی مس کمرے میں داخل ہوئیں۔ سب سے بڑی جماعت ہونے کی وجہ سے جماعت پنجم سب سے آگے بیٹھتی تھی اور میں اس وقت مس کی کرسی کے قریب بیٹھی تھی۔ چھوٹی مس نے آتے ہی بڑی مس کے سامنے ایک پیکٹ رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' بڑی مس نے پوچھا۔

''یہ کل کی میٹنگ میں ملا ہے۔اس میں کتابیں ہیں۔''

''اچھا!'' بڑی مس نے اشتیاق سے کہا ''ذرا کھولیں۔'' پیکٹ میں سے کتابیں کیا نکلیں! میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔چمک دار جلد والی کتابیں، نجانے کسی کورس کی تھیں یا کوئی اور! مس نے کتابوں کی ورق گردانی شروع کی۔ کتابوں کا شوق اور تجسّس مجھے نظر ہٹانے نہیں دے رہا تھا۔ چند عنوانات دیکھ کر ہی میں سمجھ گئی کہ یہ کتابیں کسی نصاب کی نہیں ہیں۔ کہانیوں کی کتابیں ہیں اور بچوں کے لیے ہیں۔ ضرور طالبات کو دینے کے لیے حکومت نے دی ہیں، کیوں کہ اس وقت کوئی این جی اوز تھیں نہ بہت سی اکیڈمیاں۔ آن لائن بزنس تھے نہ آف لائن بوتیکس۔ بہت سے پارلر تھے نہ کسی کو ان کا شوق۔ روزانہ کی پارٹیاں تھیں نہ سرکاری و غیر سرکاری دفاتر میں عورتوں کی ضرورت۔ آج والی افراط و تفریط نہ تھی کہ کسی اور میٹنگ کا شائبہ ہوتا۔ ہماری استانیاں اسکول کے کاموں کے لیے ہونے والی سرکاری میٹنگ کے علاوہ کوئی میٹنگ اٹینڈ نہیں کرتی تھیں اور وہ میٹنگیں سراسر طالبات کی خیر خواہی کے لیے ہی ہوتی تھیں۔ خوشی میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ بس ابھی مجھے ایک کتاب ملنے ہی والی تھی۔ ان دونوں کی مزید گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ کتابیں کسی سرکاری سلسلے میں ہی ملی ہیں۔

''اچھا! ابھی تو ان کو رکھ دیں۔'' بڑی مس نے بات ہی ختم کر دی۔ چھوٹی مس دھیرے سے اُٹھیں، کتابیں اٹھائیں، الماری کے قریب گئیں، بٹوے میں سے چابی نکالی، الماری کھولی اور کتابیں اُس میں رکھ دیں۔۔۔ پھر الماری کو تالا لگایا اور چابی اپنے بٹوے میں رکھ لی!!

میں حیران اور ششدر یہ منظر دیکھتی ہی رہ گئی۔

خوشی میری آنکھوں کے سامنے آکر نظروں سے ایک دم اوجھل ہو گئی تھی۔ کہانیوں کی پیاسی روح پیاسی ہی رہ گئی اور کہانیوں کا سمندر سراب کی طرح آگے چلا گیا۔

لیکن کیا پتا یہ کتابیں کل تقسیم ہوں!

اِسی شوق کو لیے اگلے دن اسکول پہنچی اور مس کی کرسی کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ سارا دن

پڑھائی ہوئی۔ اسباق سُنے گئے۔ ٹیسٹ لیے گئے۔ سبق پڑھائے گئے۔ ریاضی کے سوال سمجھائے گئے، لیکن نہ کھلی تو وہ الماری اور نہ تقسیم ہُوئیں تو وہ کتابیں۔۔۔!

اُس دن کے بعد میں روزانہ ہی اسی حسرت کو لے کر اسکول پہنچتی کہ شاید آج کتابیں ملیں! مگر کتابیں تو کیا ملتیں، دوبارہ وہ الماری ہی نہ کھولی گئی۔ الماری پہ نظر رکھنا میرا فرضِ عین ہو گیا تھا کہ کبھی کھولی جائے تو اُن کتابوں پہ نظر پڑے۔ اتنی زیادہ نظر کے بعد یہی پتا چلا کہ الماری کھولی ہی نہیں گئی۔ یہ اسکول کے ضروری سرکاری کاغذات کی الماری تھی، جس میں نہ جانے کتنے سال کے کاغذات رکھے تھے، جن کو دیکھا جاتا نہ ہلایا جاتا۔ کبھی کبھار ہی اِس الماری کو کھولنے کی نوبت آتی، مگر لوہے کی یہی بھولی بسری الماری اب میری توجّہ کا مرکز بن گئی تھی۔ تفریح کے وقفے میں بھی میں اِس الماری کے ارد گرد ہی منڈلاتی رہتی کہ شاید کبھی مس آ کر یہ الماری کھولیں اور میں ان کتابوں کو دیکھ لوں مگر وائے قسمت!!!

نو سالہ ذہن اتنا تو سمجھتا ہی تھا کہ یہ کتابیں استانیوں کے بچوں کے لیے نہیں ہو سکتیں، کیوں کہ جب سرکاری کام کر رہے ہیں تو حکومت سرکاری بچوں کے لیے ہی مراعات دے گی۔ نو سالہ ذہن یہ بھی سمجھتا تھا کہ یہ کہانیاں استانیوں کے لیے بھی نہیں ہیں، کیوں کہ وہ بچوں کے ذہن کی تھیں۔ میں چند عنوانات دیکھ کر ہی یہ بات سمجھ چکی تھی۔

دھیرے دھیرے سال پورا ہو گیا۔ بورڈ کا امتحان ایک دوسرے اسکول میں ہونا تھا، لہٰذا امتحان سے چند دن پہلے ہمیں فارغ کر دیا گیا اور میں اُس الماری کو بند حالت میں ہی چھوڑ کر آخری بار اس پہ الوداعی نظر ڈال کے اس اسکول سے ہمیشہ کے لیے باہر نکل آئی، پھر امتحانات ہوئے۔ نتیجہ آیا اور میرا داخلہ بڑے اسکول میں کروا دیا گیا۔

حالات کی گردش نے مصروف کر دیا۔ وقت کی ہَوا نے مجھے آگے دھکیل دیا۔ اسکول کی پڑھائی مکمل ہوئی تو شب و روز مدرسے میں گزرنے لگے، مگر نہ بھولی تو وہ الماری اور نہ بھولی تو وہ کتابیں۔۔۔ میں اکثر سوچتی کہ نجانے ان کتابوں کا کیا کیا گیا ہو! کیا معلوم وہ طالبات میں تقسیم کر دی گئی ہوں! کیا معلوم وہ پڑھ کر سُنائی گئی ہوں! کیا معلوم ان کو استانیاں اپنے گھر لے گئی ہوں! یا کیا معلوم اُن کو کیڑے کھا گئے ہوں!

شادی کے بعد ملتان شِفٹ ہوئی تو مجھے ایک مدرسے میں تدریس کے فرائض ملے۔ ابھی ایک برس ہی تدریس کی تھی، تدریس چھوٹ گئی۔ اِس صدمے سے نکلنے کے لیے ہاتھ میں قلم پکڑا تو وہ ہاتھ سے چپک ہی گیا۔ آج تک چپکا ہوا ہے الحمد للہ۔۔۔! اب میں خود کہانیاں تیار کرنے والی مشین بن گئی تھی۔ کچھ عرصہ لکھاری تیار کرنے والی مشین بھی بنی رہی۔ اِس عرصے میں کہانیاں میرے پاس چیک ہونے کے لیے آتی تھیں۔ گھر میں چند رسائل بھی آنے لگے اور جن رسائل کو کہانیاں بھیجتی وہ اعزازی شمارے بھی بھیجتے، یعنی مرے آگے پیچھے دائیں بائیں کہانیاں ہی کہانیاں ہو گئیں۔ شاید بچپن کی حسرتیں اللہ کے ہاں بہت قبول ہو جاتی ہیں!!

آج جس وقت انٹرنیٹ کا دور دورہ ہے، ہاتھ میں موبائل ہے۔ ایک کلک پہ سینکڑوں کہانیاں ہاتھ باندھے حاضر ہو جاتی ہیں۔ میرے گھر کی الماریاں کہانیوں کے رسائل سے بھری ہیں۔ نو آموز رائٹرز کی کہانیاں چیک ہونے کے لیے بھی میرے پاس آ جاتی ہیں۔ کسی میگزین کو ایک کہانی بھیجوں تو بدلے میں کہانیوں سے بھرا پورا میگزین ہی موصول ہو جاتا ہے، لیکن نجانے کیوں اس بند الماری میں رکھی کہانیوں کی اُن کتابوں کی حسرت کبھی بھی نہ بھول سکی!!

نارسائی کی اب دل میں دھڑکی کہاں
مگر اب وہ ننھی سی لڑکی کہاں

اب میرے ارد گرد کہانیاں ہی کہانیاں ہیں، لیکن ذمہ داریاں ان سے زیادہ ہیں۔ کہانیاں پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ کبھی اپنی کوئی طبع زاد کہانی یکسوئی سے لکھنے کو ہی مل جائے تو مالِ غنیمت محسوس ہوتا ہے تو کہانیاں پڑھنے کا وقت کیسے ملے گا! اس کے باوجود اس بند الماری میں موجود ان کہانیوں کا صدمہ نہیں بھولا۔ جب بھی وہ کہانیاں یاد آئیں ایک ٹھنڈی سانس نکلتی ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ صدمہ اُس وقت کا ہے، آج کا نہیں۔

اگر آپ کسی تعلیمی ادارے سے وابستہ ہیں تو اپنے طلبہ و طالبات کے حقوق پورے کیجیے۔ جس طرح آپ کے لیے آپ کی تنخواہ اہم ہے، اِسی طرح ان بچوں اور بچیوں کے لیے ان کی خواہشات اہم ہیں۔

مجھے یاد ہے، جب میں بڑے اسکول میں داخل ہوئی، وہاں اسکول کے قریب ایک بابا جی پاکٹ سائز کہانیاں بیچتے تھے، جو ٹارزن کی ہوتی تھیں۔ ایک کہانی ایک اٹھنّی کی ہوتی تھی اور ہم سب بچیاں بہت شوق سے پڑھتی تھیں۔ اس وقت کے بچے جلد اردو پڑھنا سیکھ جاتے تھے۔ جب میں چھٹی جماعت میں تھی تو ہماری جماعت میں ایک لڑکی کہانیوں کی مجھ سے بھی زیادہ شوقین تھی۔ صبح اسمبلی سے بیس پچیس منٹ پہلے اسکول پہنچ جاتی۔ اسے جیب خرچ ایک اٹھنّی ملتی تھی۔ وہ بابا جی کے پاس جا کر کہانی خریدتی۔ تیزی سے اسکول میں داخل ہوتی۔ خوش قسمتی سے ہمارا کلاس روم بھی گیٹ کے قریب ہی تھا۔ وہ کلاس روم میں جا کر تیزی سے کہانی پڑھنا شروع کرتی۔ نظر سے ہی (ہونٹ ہلائے بغیر) کہانی پڑھتی جاتی اور گھسیٹتے ہوئے تین چار منٹ میں ہی مکمل کر کے باہر کو دوڑ لگاتی۔ دھم سے بابا جی کے پاس پہنچ کر کہتی: ”بابا! اے کہانی ٹھیک نئیں وا“ (بابا جی! یہ کہانی ٹھیک نہیں)

”کی ہویا وا اس کہانی نوں؟“ (کیا ہُوا ہے اس کہانی کو) اَن پڑھ بابا جی حیرت سے پوچھتے۔

”ایدے صفحے اگے پچھے وا“ (اس کے صفحے آگے پیچھے ہیں) وہ صفحے کھول کر بھی دکھاتی، جہاں تمام صفحات گنتی کی ترتیب سے ہی لگے ہوتے اور بابا جی کہانی تبدیل کر دیتے!

وہ کلاس روم کو دوڑتی۔ چند منٹ میں ہی کہانی پڑھ کر دوبارہ بابا جی کے پاس! ”بابا! آ کہانی وی ٹھیک نئیں“ (بابا جی! یہ کہانی بھی ٹھیک نہیں)

تھوڑی سی بحث کے بعد بابا جی کہانی تبدیل کر دیتے۔ اس طرح کرتے کرتے وہ اسمبلی سے پہلے ایک اٹھنّی سے ہی تین چار کہانیاں پڑھ لیتی۔

آج جب آپی ناجیہ شعیب نے مجھ سے کتابوں کے بیچنے کی بات کی تو میرا کہانیوں کا درد سامنے آ کھڑا ہُوا اور میں یہی مشورہ دے پائی ہوں کہ بچوں کی کہانیوں کی ان کتابوں کو بچوں کے ہی کسی اسکول کی اسٹیشنری کی دوکان میں رکھوا دیں، لیکن بیچنے کی ترتیب ایسی ہو کہ کتابیں ڈائریکٹ بچوں کے ہاتھ میں جائیں۔ ان شاءاللہ کتابیں بھی بِک جائیں گی اور بچے بھی خوش ہو جائیں گے۔ بس اُن کتابوں کو بیچنے والے بابا جی پڑھے لکھے اور ہوشیار ہونا چاہییں!

دستِ مسیحا

میر جواد ٹالپر

فجر کی اذان ابھی مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ ڈاکٹر زارا کی آنکھ کھل گئی۔ الارم کی ضرورت تو پتا نہیں اسے کب کی ختم ہو چکی تھی۔ ہسپتال کی روٹین جیسے اس کے اعصاب میں ہی بس چکی تھی۔ چھت کو گھورتے اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے سوچا۔۔۔ ایک اور دن، ایک اور جنگ۔

جلدی جلدی تیار ہو کر وہ کمرے سے باہر نکلی، اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے دن بہ دن گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ سفید کوٹ کندھے پر رکھتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے تھکن ابھری۔ یہ کوٹ اس کی پہچان تھا، مگر اب جیسے بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے پلٹ کر گھر کو دیکھا جیسے سکون وہیں چھوڑ کر جا رہی ہو۔

”کیا میری زندگی کا مقصد بس یہی ہے؟ اٹھنا، سنبھلنا اور خود کو بھول جانا؟“ اس نے سوچا اور اگلے ہی لمحے اس سوچ کو جھٹک کر گھر سے نکل گئی۔

ہسپتال کے دروازے پر قدم رکھتے ہی جراثیم کش دوا کی تیز بو، اسٹریچر کے پہیوں کی آواز اور دور کہیں کسی مریض کی کراہنے کی آوازیں، سب ایک ساتھ ہی اس کے حواسوں پر حملہ آور ہوئے۔ اس نے سفید کوٹ کو درست کیا اور خود کو حالات کے سپرد کر دیا۔

دوپہر تک اس کے قدم تھک کر بوجھل ہو جاتے تھے، مگر چہرے پر وہی پیشہ ورانہ سنجیدگی قائم رہتی۔ کوئی اندازہ تک نہیں کر سکتا تھا کہ اس مسکراتے چہرے کے پیچھے نیند کی کمی، ذہنی دباؤ اور تنہائی چھپی ہوئی ہے۔

وہ ایک لمحے کو کھڑکی کے پاس رُکی، باہر کی زندگی پوری رفتار سے رواں تھی، مگر وارڈ کے اندر وقت جیسے زندگی اور موت کے بیچ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے پتا تھا کہ یہاں دن اور رات کی حدیں مٹ جاتی ہیں۔ وہ تھک گئی تھی، مگر کسی کے لیے اس کی تھکن کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

”یہ وہ زندگی تو نہیں، جس کے میں نے خواب دیکھے تھے۔“ وہ خود سے سوال کرتی مگر اس کا جواب اسے کبھی نہیں ملا۔

ڈاکٹر زارا پوسٹ گریجویشن کر رہی تھی۔ پوسٹ گریجویٹ کے پہلے دن ہی ہسپتال کے گیٹ پر قدم رکھتے ہی شور نے اس کا استقبال کیا۔ اب وہ ایم بی بی ایس کی طالبہ نہیں تھی اور نہ ہی ہاؤس آفیسر! اب وہ ایک ذمے دار ڈاکٹر تھی۔ پہلے دن کی ہی بھاگ دوڑ میں اسے لگا جیسے اس نے صدیاں گذار دی ہوں، حالاں کہ یہ تو ابھی صرف ایک آغاز تھا، منزل تو ابھی بہت دور تھی۔ پی جی شپ کے پہلے دن وہی سب اس پر دوبارہ ٹوٹ پڑا تھا، مگر اب شدّت کے ساتھ۔

آن کال کے نام پر وہ چھتیس چھتیس گھنٹے ہسپتال میں رہتی۔ تنخواہ کے نام پر جو رقم اسے ملتی تھی، وہ اس تھکن، ذمے داری اور ذہنی اذیت کے مقابلے میں ایک مذاق تھی۔ تنخواہ جب ہاتھ میں آتی تب وہ سوچتی۔

”کیا ایک انسان کی نیند، صحت اور ذہن کی قیمت واقعی ہی اتنی ہے؟“ یہاں شفا دینے والوں کے زخموں کا کوئی معالج نہیں تھا۔ صبح کے راؤنڈ میں تھوڑی سی غلطی پر سب کے سامنے جونیئر ڈاکٹر کو قصوروار ٹھہرایا جاتا۔

”تم لوگ ریپلیس ایبل ہو، ایک جاؤ تو دس اور آجائیں گے۔“

زارا کو پہلی بار محسوس ہوا کہ اس نظام میں جونیئر ڈاکٹر انسان نہیں، ایک استعمال کی جانے والی چیز ہے۔ یہاں غلطی کی سزا تذلیل اور خاموشی ہی واحد حفاظت تھی۔

اس دن بھی وارڈ معمول سے زیادہ بھرا ہوا تھا۔ زارا مسلسل تین راتوں سے نیند سے محروم تھی۔ ایک مریض پوسٹ آپریٹو پیچیدگیوں کے ساتھ داخل ہوا۔ زارا کو خاص ہدایت دی گئی کہ اس مریض کا خیال رکھے، کیوں کہ اس کی حالت کسی بھی وقت بگڑ سکتی تھی۔ دوپہر کے وقت وارڈ میں ہنگامہ بڑھ گیا۔ ایک ایمرجنسی پھر دوسری، اسی دوران مریض کی حالت بگڑنے لگی۔ بلڈ پریشر آہستہ آہستہ گرنے لگا، نبض بھی کم زور ہو کر چلنا رُک گئی اور کچھ ہی دیر میں اس مریض کی موت واقع ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے وارڈ میدانِ جنگ بن گیا۔

”تم نے مارا ہے ہمارے مریض کو، کہاں تھی اتنی دیر؟“ مریض کے کسی رشتے دار نے زارا کے ہاتھوں میں موجود فائل کو ہوا میں اڑایا۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے؟ آپ کا مریض پہلے سے ہی بُری حالت میں تھا۔“ زارا نے اپنا دفاع کیا۔

”تم ڈاکٹر نہیں، ایک قاتل ہو۔“ کنسلٹنٹ کے آنے پر معاملہ وقتی طور پر سنبھل گیا تھا۔

کانفرنس روم میں ٹیبل کے گرد کنسلٹنٹ بیٹھا ہوا تھا۔

”ڈاکٹر زارا! آپ کی لاپروائی کی وجہ سے آج ایک مریض کی موت ہوئی ہے۔ اگر آپ پریشر ہینڈل نہیں کر سکتیں تو یہ پی جی شپ آپ کے لیے نہیں۔ بہتر ہے کہ ٹیچنگ سائڈ پر غور کریں۔“ لفظ عام تھے، مگر وار گہرا تھا۔

”آپ کو بیسک چیز بھی نہیں معلوم کہ پوسٹ آپریٹو پیشنٹ میں ان ایکسپلینڈ ہائپو ٹینشن صرف ڈی ہائڈریشن نہیں ہوتی۔“

”یہ کیس تاخیر سے نگہداشت بڑھانے (delay in escalation of care) کے زمرے میں آئے گا۔“ کنسلٹنٹ نے

فائنل بند کرتے ہوئے کہا۔

کانفرنس روم سے نکل کر زارا سیدھا واش روم میں گئی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے، زرد چہرہ، آنکھوں میں وہ اعتماد ختم ہو چکا تھا، جو کبھی انٹری ٹیسٹ دینے کے وقت تھا۔

ہسپتال سے آنے کے بعد زارا کو شدید قسم کا سر درد شروع ہو گیا۔ اس کا دماغ ابھی بھی ہسپتال کے شور میں گھرا ہوا تھا۔ کنسلٹنٹ کے طنز، سینئرز کی سختی، ہر چھوٹی غلطی پر سب کے سامنے بے عزتی، سب اس نظام کا حصہ تھا۔ اسے سمجھ آ گیا تھا کہ میڈیکل کوئی حلوہ کھانے کی چیز نہیں ہے، بلکہ ایک تپتی ہوئی آگ ہے، جس میں انسان کندن بنتا ہے، مگر کئی بار جل کر راکھ بھی ہو جاتا ہے۔ ہر آگ کندن نہیں بناتی، کچھ انسان تو بس اس آگ میں جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ زارا کو یقین تھا کہ وہ اس آگ میں جل کر کندن ہونے کی بجائے راکھ ہو جائے گی۔ دور کے ڈھول سہانے! مگر ان کے پیچھے کی حقیقت وہ لوگ ہی جان پاتے ہیں جن پر گزر رہی ہوتی ہے۔ کئی دنوں کی رت جگے کے بعد بھی نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ نیند کی گولیاں کھا کر وہ بستر پر لیٹ گئی۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی اس کی آنکھ پھر سے کھل گئی۔

’’مجھے ہسپتال جانا ہے، بہت کام ہو گا وہاں پر۔‘‘ زارا نیند کی گولی کے زیر اثر بول رہی تھی۔

’’نہیں بیٹا، آج چھوڑو! آج میں تمہیں کہیں اور لے کر چلتی ہوں۔‘‘ زارا کی ماں نے سوچ لیا کہ آج زارا کو کہاں لے کر جانا ہے۔

’’پچھلے محلے میں ایک باجی درس دیتی ہیں، روحانی علاج کرتی ہیں۔ مایوسی کے دلدل میں دھنسے لوگوں کو قرآن اور حدیث کی روشنی سے نکالتی ہیں۔ آج ہم وہاں جائیں گے، ہو سکتا ہے تمہیں بھی اس کی باتیں سن کر سکون مل جائے۔‘‘ زارا کی ماں نے بتایا۔

باجی کے گھر میں داخل ہوتے ہی زارا کو عجیب سا سکون محسوس ہوا۔ کچھ ہی دیر میں درس شروع ہونے والا تھا۔ باجی کو دیکھتے ہی زارا ششدر رہ گئی۔ وہ ملاحہ تھی، پُرسکون، مطمئن اور روشن چہرے کے ساتھ۔

زارا اور ملاحہ انٹر کلاس تک ایک ساتھ ہی پڑھی تھیں۔ اپنی قابلیت اور ذہانت کے بل بوتے پر دونوں کو ہی یقین تھا کہ وہ میڈیکل میں سلیکٹ ہو جائیں گی۔ زارا کہتی کہ اگر وہ میڈیکل میں سلیکٹ نہیں ہوئی تو مر جائے گی اور ملاحہ کہتی کہ اگر وہ نہیں ہوئی تو اللہ تعالیٰ کی رضا سمجھ کر قبول کر لے گی۔ قسمت نے ملاحہ کو آزمانے کے لیے عجیب کھیل کھیلا۔ زارا سلیکٹ ہو گئی جبکہ ملاحہ کچھ پوائنٹس کی وجہ سے رہ گئی اور یہاں سے دونوں کی راہیں جدا ہو گئیں۔ اس وقت زارا اپنے آپ کو دنیا کی خوش نصیب لڑکی سمجھ رہی تھی اور ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی تھا کہ ملاحہ کسی طور پر اس سے کم نہیں تھی، بس قسمت نے اس کا امتحان سخت کر دیا تھا۔ اس وقت سب ملاحہ کو بدنصیب سمجھ رہے تھے کہ اتنی ذہین ہونے کے باوجود بھی ڈاکٹر بننے سے رہ گئی۔ کسی حد تک زارا کو بھی یہی لگتا تھا اور آج ملاحہ کو اتنا پُر سکون، مطمئن اور خوش دیکھ کر اسے ایک جھٹکا لگا تھا۔

میڈیکل انٹری ٹیسٹ کے بعد ملاحہ کی زندگی ایک لمحے میں بدل گئی تھی۔ سب کچھ اس کے دماغ پر ایسے نقش ہو گیا تھا جیسے کسی نے گرم چیز سے اس کے ذہن کو داغ دیا ہو۔ آہستہ آہستہ اس نے سیکھا کہ ہر بند دروازہ سزا نہیں ہوتا، بعض اوقات وہ حفاظت ہوتی ہے۔ جب اس نے عالمہ بننے کا فیصلہ کیا تو یہ کسی مجبوری کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ ایک شعوری انتخاب تھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ شفا صرف جسموں کو نہیں دی جاتی، علاج صرف جسم کا نہیں کیا جاتا، بعض روحیں بھی علاج مانگتی ہیں۔

’’زارا! تم ڈاکٹر ہو، یہ صرف تمہاری پیشہ ورانہ پہچان نہیں، بلکہ ایک بہت بڑی عزت ہے۔ دستِ مسیحا ہونا آسان نہیں ہوتا۔ تم انسانوں کی جان بچا رہی ہو، یہ خدمت ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔‘‘ ملاحہ کتنی دیر تک اسے سمجھاتی رہی۔

’’زارا! اگر تم دل سے سچائی اور خدمت اختیار کرو تو ایک دن تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گی۔‘‘ ملاحہ نے اسے جاتے ہوئے دعا دی۔

گاڑی میں ماں کندھے پر سر رکھ کر اس کے آنسو خاموشی سے بہہ رہے تھے۔ زارا اب تک ملاحہ کو ناکام اور بدنصیب سمجھتی تھی، لیکن جو دین کو پالے وہ ناکام اور بدنصیب کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ دنیا کی نظر میں کامیاب ہونا چاہتی تھی، اس کے نزدیک کامیاب کا مطلب ’’دنیا کا تالیاں بجانا‘‘ پھر چاہے اس پر انسان کی صحت اور ذہنی سکون ہی کیوں نہ داؤ پر لگ جائے۔ اس کی غلطی بس اتنی تھی کہ اس کے کامیابی کے پیمانے ہی غلط تھے۔ کامیابی کے وہ پیمانے جو اکثر معاشرہ طے کرتا ہے، انسان کو اس کی ذات، سکون اور روح سے کاٹ دیتے ہیں۔ ملاحہ اپنی منزل تک پہنچ چکی تھی اور وہ اتنا کچھ طے کر کے بھی ابھی تک سفر میں ہی تھی۔ بے اختیار اسے ایک شعر یاد آیا۔

کسی کو گھر سے نکلتے ہی منزل مل گئی
کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

تزکیۂ نفس کیا ہے؟

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے فرمایا: تزکیۂ نفس کا نام، تصوف ہے۔ روح کو کینے، ہوا و حرص، غصّے، آپس کی رنجش اور طمع وغیرہ امراض سے پاک کرنے کا نام، طریقت ہے۔ جس طرح جسمانی بیماریاں ہوتی ہیں، اسی طرح روح کو بھی قسم قسم کے امراض لاحق ہوتے ہیں۔ جسم کے طبیب، ڈاکٹر حکیم ہیں اور روح کے معالج، انبیا اور اولیا ہیں۔

نماز ہم بھی پڑھتے ہیں، مگر ہماری نماز اور عارف کی نماز میں بہت فرق ہے۔ دیکھنے میں وہ ہماری طرح رکوع اور سجود کرتا ہے، مگر باطن میں نماز اس کی کچھ اور ہی چیز ہے۔ آیت اور تلاوت تو وہ ہماری ہی طرح کرتا ہے، مگر وہ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ کا پورا عامل ہوتا ہے۔ (خطبات شبلی)

BAITUSSALAM LABORATORY & DIAGNOSTIC CENTRE

Laboratory

X-Ray

OPD

Dental Care

Eye Care

Ultra Sound & Color doppler

+92 21 35392634 +92 334 2982988 lab@baitussalam.org

جستجو

ملائکہ سلیمان

"آج سے میری اور تمہاری دوستی ختم! للذا اب مجھ سے دوستی قائم رکھنے کی توقع مت رکھنا۔" رفیق جو اپنے نوٹ بک میں جُھکا لکھ رہا تھا۔ انور کی آواز سن کر سر اٹھایا اور حیرت سے انور کو دیکھنے لگا، جو اُسے بولنے کا موقع دیے بغیر بولے جا رہا تھا۔ انور کی بات مکمل ہوتے ہی رفیق کی فراخ پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

"تم میرے بچپن کے دوست ہو۔ اتنی آسانی سے دوستی کیسے ختم کر سکتے ہو؟" رفیق اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور صدمے سے بولا۔

"مجھے تم سے دوستی قائم نہیں رکھنی، اس لیے دوستی ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔" انور نے ایک اچٹتی نگاہ رفیق پر ڈال کر کہا، لہجے میں بیزاریت تھی۔

"کوئی تو وجہ ہو گی نا! جس کی وجہ سے تم دوستی توڑ رہے ہو؟" کہتے ہوئے رفیق کی آواز بھیگ گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے، مگر انور ان سب سے لاپروا کھڑا رہا۔

"وجہ ہے اور وہ بھی بڑی! مگر تمہیں بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" انور نے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔

"وجہ بتاؤ؟" رفیق کی آواز میں اب تھوڑی سختی در آئی تھی۔

"وجہ یہ ہے کہ تم ایک نالائق طالب علم ہو اور تمہاری اس نالائقی کی وجہ سے میں تم سے اب دوستی نہیں رکھ سکتا، کیوں کہ تمہاری وجہ سے مجھے سارے نالائق کا دوست کہیں گے، جو میں برداشت نہیں کر سکتا۔" انور کی بات سن کر رفیق سن کھڑا رہ گیا تھا۔ جب کہ انور نے کہہ کر اپنا بیگ اٹھایا اور وہاں سے چلا گیا۔

"کیا ہوا رفیق۔۔۔؟ یہاں اس طرح پریشان کیوں بیٹھے ہو؟" محسن کینٹین کی جانب جا رہا تھا جو اس سے سینئر اور اسکول کا سب سے بہترین طالب علم تھا۔

جب محسن نے رفیق کو گم سم سا بیٹھا، ہاتھوں کو پیالے کی صورت میں بنائے کسی گہری سوچ میں گم پایا تو اس کی جانب چلا آیا اور اس کے پاس بیٹھ کر دریافت کرنے لگا۔

"بھائی! آپ کو معلوم ہے، میرے بچپن کے دوست نے مجھ سے دوستی توڑ دی۔" رفیق نے روتے ہوئے ساری روداد محسن کے گوش گزار کر دی۔

"اُوہو۔۔۔ بچے روتے نہیں، خاموش ہو جاؤ۔ ان قیمتی آنسوؤں کو ضائع نہیں کرو۔ میری بات غور سے سنو اور عمل کرو، پھر دیکھنا سب اچھّا اچھّا ہو جائے گا۔" محسن نے رفیق کو پیار سے پچکارا اور پُرجوش ہو کر کہا تو رفیق کو کچھ اطمینان ہوا تھا۔

"ج۔۔۔ جج۔۔۔ ی کہ۔۔۔ یں۔" رفیق رونے کے درمیان بولا تھا۔

"ایسے نہیں، پہلے رونا بند کرو، پھر۔" محسن نے پاس رکھے کولر سے گلاس میں پانی بھرا اور اس کی طرف بڑھا کر بولا۔

رفیق نے جھٹ سے گلاس لے لیا اور پانی پی کر اپنے آنسو صاف کرنے لگا۔

"کامیابی اور ناکامی ہماری زندگی کا حصہ ہیں۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم کامیابی کو چنتے ہیں یا ناکامی کو۔۔۔ جب آپ کے دل میں ایک پختہ اُمید ہو، حوصلہ ہو، کچھ کر گزرنے کا جذبہ ہو تو پھر انسان کی راہ میں کوئی بھی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ بس آپ نے پُرعزم بننا ہے اور اپنی منزل تک پہنچنے کی جستجو کرنی ہے۔۔۔ پھر آپ دیکھنا کامیابی خود آپ کا استقبال کرے گی، ہر طرف آپ کا بول بالا ہو گا۔" محسن ایک ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے جوش و جذبے کے ساتھ رفیق کو سمجھا رہا تھا۔

"محسن بھائی! میں کامیاب ہونے کی کوشش کرتا ہوں، مگر ناکام ٹھہر جاتا ہوں۔" رفیق کے لہجے میں اُداسی تھی۔

"ہماری یہی بات بُری ہے کہ ہم ایک بار کوشش کرنے کے بعد ہار مان جاتے ہیں۔ دوبارہ کوشش کرنے کی ہمت نہیں کرتے۔ اُداسی و افسوس کو دل میں بسا لیتے ہیں اور اس طرح سے ہم کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمیں کوشش اُس وقت تک کرتے رہنا چاہیے، جب تک کامیابی نہیں مل جاتی۔" محسن کا کہا گیا لفظ بہ لفظ رفیق کے دل و دماغ میں گہرا اثر کر رہا تھا۔

"میں آپ کی بات بہ خوبی سمجھ گیا ہوں۔ اب میں ہار کو تسلیم ہرگز نہیں کروں گا، بلکہ جیت کر دکھاؤں گا۔" کچھ دیر پہلے جس چہرے پر پریشانی و حزن تھا۔ اب وہ چہرہ ایک روشن اُمید کی مانند جگمگا رہا تھا۔

رفیق کے امتحان میں پورے تین ماہ باقی تھے، مگر وہ ابھی سے آدھی رات تک پڑھائی خوب دل لگا کر کر رہا تھا۔

اب اس کا سارا دھیان پڑھائی کی طرف مبذول تھا۔ گھر والے بھی بہت خوش تھے۔ رفیق کو یقین تھا کہ وہ اس دفعہ ضرور کامیاب ہو گا۔ مہینے بہت تیزی سے گزر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے رفیق کو منظم شیڈول مل گیا تھا۔

اس نے پہلے ہی پیپرز کی ساری تیاری مکمل کر لی تھی۔ اس لیے رفیق کو کوئی پریشانی لاحق نہیں تھی۔

امتحان کا دن آ ٹھہرا۔ رفیق نے امتحانی پرچہ لے کر سب سے پہلے دعا پڑھی اور لکھنا شروع کیا۔

رفیق بہت انہماک سے لکھ رہا تھا۔ جب کہ کچھ بچے پریشانی میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

رفیق نے اپنی کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔

وقت بہت کم تھا اور کام زیادہ۔ رفیق جلدی جلدی ہاتھ چلا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد رفیق نے جھکا سر اٹھایا۔

رفیق کو یقین تھا، اس دفعہ وہ ضرور جیتے گا اور ہوا بھی یہی۔ رفیق اپنے کلاس میں ہی نہیں بلکہ اسکول میں ٹاپ کیا تھا۔

رفیق کی خوشی کا اندازہ اُس کے چہرے سے لگایا جا سکتا تھا۔ انور کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

اُس نے رفیق سے معافی مانگی اور کامیابی کی خوشی میں دعوت پیش کی، جو رفیق نے خوشی قبول کی تھی۔

جنّت کے مسافر

ساجدہ امیر

صبح کے نرم اُجالے میں مسجد کے محراب سے تلاوت کی آوازیں گونج رہیں تھی۔ مسجد کے ایک کونے میں معصوم بچوں کے لبوں سے نکلے قرآن کے الفاظ فضا میں نور بھر رہے تھے اور دوسری طرف بڑے بزرگ تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے۔ اچانک مولوی صاحب کو پیچھے سے دو بچوں کے لڑنے کی آواز سنائی دی۔

"کیا ہو رہا ہے وہاں؟" مولوی صاحب کی آواز سن کر سب خاموش ہو گئے، تب حسن نے آہستہ سے کہا: "مولوی صاحب! علی نے مجھے پیچھے سے مکا مارا ہے اور اب جھوٹ بول رہا ہے کہ میں نے نہیں مارا۔"

علی فوراً بولا: "میں نے نہیں مارا مولوی صاحب!" دونوں کی بات سن کر مولوی صاحب نے انھیں بلایا اور شفقت سے اپنے پاس بٹھایا۔

سب بچے خاموش ہو گئے، اب صرف مولوی صاحب کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"دیکھو علی! جھوٹ بولنا بُری بات ہے۔ اگر آپ نے حسن کو مارا ہے تو معافی مانگنے میں کوئی بُرائی نہیں ہے، اُلٹا ایک غلطی کو چھپانے کے لیے ہم کئی جھوٹ بولتے ہیں اور جھوٹ ہمیں دوزخ میں لے جاتا ہے۔"

مولوی صاحب کی بات سن کر علی نے حسن سے معافی مانگی اور پھر حسن سے کہا: "حسن! کسی کو معاف کر دینا بہت بڑی نیکی ہے، جو اللہ کی رضا کے لیے کسی کو معاف کرتا ہے۔ روزِ محشر اللہ بھی اس کے گناہ معاف کرے گا اور کیا پتا۔۔۔ تب ہماری نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو جائے اور ہم جنّت میں چلیں جائیں۔" اس بات پر حسن مسکرایا اور علی کی طرف دیکھا۔

"علی! میں اللہ کی رضا کے لیے تمہیں معاف کرتا ہوں۔" حسن کے جملے پر مولوی صاحب مسکرا دیے۔

"بچو! آپ کو پتا ہے، انسان کو ہمیشہ سچ کا ساتھ دینا چاہیے، کیوں کہ سچ کا درخت جنّت میں ہے اور اس کی شاخیں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں، جو انسان سچ بولتا ہے وہ ان شاخوں کے ذریعے جنّت میں پہنچ جاتا ہے اور جھوٹ کا درخت دوزخ میں ہے جو انسان ہر بات پہ جھوٹ بولتا ہے، وہ دوزخ میں پہنچ جاتا ہے اور دوزخ بُرا ٹھکانا ہے۔" مولوی صاحب کی بات سب بچے غور سے سننے لگ گئے۔

اتوار کو اسکول سے چھٹی ہونے کے باعث مولوی صاحب بچوں کو کافی دیر مسجد میں روکے رکھتے اور انھیں اچھی اچھی باتیں بتاتے تھے۔ آج اتوار تھا۔ سبق سنا کر سب بچے قطار در قطار بیٹھ گئے۔

آج علی اور حسن کی لڑائی پر ان کی صلح کراتے ہوئے مولوی صاحب نے جنّت اور دوزخ کا ذکر کیا تو ایک بچہ جس کا نام سلیمان تھا، تجسّس سے بولا: "مولوی صاحب! یہ جنّت اور دوزخ کیا ہیں؟" سلیمان کا سوال سن کر مولوی صاحب نے سب بچوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"بچو! جنّت اور دوزخ اللہ کے بنائے دو ٹھکانے ہیں۔ جنّت اللہ کے پیارے اور نیک بندوں کا ٹھکانا ہے، جس میں دودھ کی، شہد کی نہریں، میٹھے پھل، پھول اور بہت ساری ایسی چیزیں ہوں گی، جسے دیکھ کر انسان دنگ رہے جائے گا۔ دوسری طرف دوزخ بُرے لوگوں کا ٹھکانا ہے، جو اللہ کا حکم نہیں مانتے، جھوٹ بولتے ہیں، دوسروں کو پریشان کرتے ہیں، نماز ادا نہیں کرتے بلکہ ہر وقت اللہ کو ناراض کرنے والے کام کرتے ہیں۔ ان کی جگہ دوزخ میں ہو گی۔ دوزخ میں پانی نہیں ہو گا، کھانا نہیں ہو گا۔ وہاں صرف عذاب ہو گا۔" دوزخ کا سن کر سب بچے ڈر گئے۔ انھیں دیکھ کر مولوی صاحب نے سوال کیا۔

"کیا آپ کو پتا ہے جنّت کے کتنے دروازے ہیں؟"

ایک بچہ بولا: "آٹھ دروازے ہیں استاد جی!" اس کا جواب سن کر استاد جی مسکرائے اور شاباش دی۔

پھر پوچھا: "دوزخ کے کتنے دروازے ہیں؟"

سب خاموش رہے کسی نے جواب نہ دیا تو مولوی صاحب نے بتایا: "دوزخ کے سات دروازے ہیں۔" اس گفتگو سے مسجد میں آئے نمازی بہت متاثر ہوئے اور ڈھیرے ڈھیرے سب لوگ وہاں جمع ہو گئے۔

وہاں موجود ایک شخص نے پوچھا: "مولوی صاحب! کیا جنّتیں بھی الگ الگ درجات کی ہیں؟" مولوی صاحب ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

"جی بالکل! جیسے ہر انسان کے اعمال الگ الگ ہیں، ویسے ہی جنّت کے درجات بھی الگ الگ ہیں۔ ہر شخص کو اس کے درجات کے مطابق نوازا جائے گا۔ کل آٹھ جنّتیں ہیں (جنّتِ عدن، جنّتِ ماویٰ، جنّتُ الفردوس، جنّتِ نعیم، دارُالجلال، دارُالقرار، دارُالسلام اور جنّتِ خُلد) جنّت الفردوس وہ مقام ہے، جس کا ذکر قرآن میں بھی ہے کہ یہاں شہدا، انبیاء، صدیقین اور اللہ کے خاص محبوب بندے ہوں گے، جو ہر حال میں اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

مسجد میں موجود ہر شخص کے ذہن میں جنّت کا عکس بننے لگا، صبح صبح اللہ کی جنّت کا سن کر سب کے ایمان تازہ ہو گئے۔

"مولوی صاحب! جس قدر جنّت خوب صورت ہے، ویسے ہی دوزخ بھی خوف ناک ہو گی؟" ایک اور شخص نے پوچھا: "جی بالکل! جس طرح اللہ نے نیک لوگوں کے لیے الگ الگ درجات بنائے ہیں ویسے ہی بُرائی پھیلانے والوں کے لیے بھی دروزخ کے بھی الگ مقام ہیں، کہیں ٹھنڈا اتنی کہ انسان جم جائے، کہیں آگ بہت، کہیں پتھروں کا عذاب تو کہیں کانٹے دار خوراک کے ساتھ سانپ اور بچھو کا عذاب ہے۔"

جب مولوی صاحب کی بات ختم ہوئی تو علی نے کہا: "آج کے بعد میں کسی کو تنگ نہیں کروں گا، بلکہ میں اچھا بچہ بن کر رہوں گا، تاکہ اللہ جی مجھے اپنا خاص بندہ بنا لے۔" علی کی بات سن کر مولوی صاحب مسکرائے۔

"بالکل! ہم سب کو اللہ کے پسندیدہ بندوں میں شامل ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

تب ایک شخص اونچی آواز میں بولا: "مولوی صاحب! دعا کریں کہ ہم بھی جنّت الفردوس کے مسافر بن جائیں۔"

تب مولوی صاحب بولے: "آمین۔۔۔! لیکن دعا سے کچھ نہیں ہو گا، ہمیں جنّت الفردوس تک پہنچنے کے لیے خود محنت کرنی پڑے گی۔ نیکی کرنا مشکل نہیں ہے، لیکن نیکی کو سنبھال کے رکھنا مشکل ہے۔ اس لیے ہمیں کسی کو بلاوجہ تنگ نہیں کرنا چاہیے، نہ ہی ایسے کام کرنے چاہییں جس سے ہماری نیکیاں ضائع ہو جائیں۔ رحم دل بنیں، دوسروں کی مدد کریں اور اللہ کے رسول ﷺ کے بتائے احکامات پر عمل کریں، تاکہ ہم بھی جنّت الفردوس میں جائیں۔" اس دن سب بچوں نے عہد کیا کہ وہ جنّت میں جانے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے اور سب بڑوں کو احساس ہوا کہ ہماری ذرا سی لاپرواہی کئی نیکیاں ضائع کر سکتی ہے اس لیے سنبھل کر زندگی گزاریں۔

پہلا قطرہ

عبدالحفیظ شاہد

صارم آٹھویں جماعت کا ذہین طالبِ علم تھا۔ وہ اپنی امی کے ساتھ لاہور سے راولپنڈی سفر کر رہا تھا۔ موٹروے پر سفر آرام دہ تھا، لیکن طویل راستہ تھا، اس لیے جب گاڑی ایک عارضی آرام گاہ پر رُکی تو وہ اور اس کی امی تازہ دَم ہونے کے لیے نیچے اترے۔

یہ ایک مصروف جگہ تھی، جہاں مختلف مسافر اپنی گاڑیوں سے اتر کر چائے پی رہے تھے، کچھ لوگ نماز کے لیے وضو کر رہے تھے، کچھ بچے بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔ صارم نے وہاں ایک خاتون کو دیکھا، جن کے ساتھ دو جڑواں بچے تھے۔ بچے بہت شرارتی لگ رہے تھے اور خاتون کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ وہ اپنے دونوں بچوں کو واش روم لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں، لیکن ایک بچہ اچانک اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگ نکلا۔ خاتون کے چہرے پر گھبراہٹ واضح ہو گئی۔

وہ بچہ دوڑتا ہوا سڑک کی دوسری طرف جانے لگا، جہاں تیز رفتار گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ خاتون ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئی، لیکن پھر حواس بحال کرتے ہوئے جلدی سے آگے بڑھیں۔ خوش قسمتی سے ایک مسافر نے جلدی سے بچے کو روک لیا اور اس کی ماں کے حوالے کر دیا۔ خاتون نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے دونوں بچوں کو سینے سے لگا لیا۔

صارم نے یہ سب دیکھا اور مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ وہ اپنی امی کے ساتھ ہلکی پھلکی پیٹ پوجا کرنے ریسٹورینٹ کے اندر چلا گیا۔ واپسی پر چائے لینے اسٹال کی طرف بڑھ گیا۔ چائے کی خوش بو اور ذائقہ مزے کا تھا۔

چند منٹ بعد، گاڑی روانہ ہونے کا وقت قریب آ گیا۔ پندرہ منٹ مکمل ہوتے ہی ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کر دیا اور گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ صارم نے دیکھا کہ وہ خاتون ابھی تک واپس نہیں آئی تھیں۔ شاید وہ اپنے بچوں کے ساتھ کہیں مصروف تھیں۔

صارم فوراً آگے بڑھا اور ڈرائیور سے مؤدبانہ انداز میں کہا: ”انکل! براہِ کرم گاڑی روک لیجیے! وہ خاتون ابھی آئی نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ دو چھوٹے بچے بھی ہیں۔“

ڈرائیور نے ایک نظر صارم کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے بولا: ”بیٹا! یہ کمپنی کی پالیسی ہے کہ گاڑی ایک مقرّرہ وقت پر چلتی ہے۔ ہم زیادہ دیر رُک نہیں سکتے۔“

صارم کے چہرے پر فکر کی لہر دوڑ گئی۔ ”لیکن انکل! وہ خاتون مشکل میں ہیں، اگر ہم انھیں چھوڑ کر چلے گئے تو وہ بچوں کے ساتھ یہاں اکیلی رہ جائیں گی۔ ایسا کرنا مناسب نہیں ہے۔“

ڈرائیور نے شانے اُچکائے اور کہا: ”بیٹا! میں کچھ نہیں کر سکتا، کمپنی کے اصول ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

صارم کا دل بے چین ہو گیا۔ اس نے ارد گرد دیکھ کر مسافروں سے مخاطب ہو کر بلند آواز میں کہا: ”یہ خاتون اکیلی سفر کر رہی ہیں۔ اگر ہم انھیں یہیں چھوڑ گئے تو ان پر کیا گزرے گی؟ کیا ہم انسانیت کے ناطے پانچ منٹ مزید نہیں رُک سکتے؟“ صارم کی بات میں سچائی تھی اور اس کا انداز ایسا تھا کہ سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ایک صاحب بولے: ”یہ بچہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں تھوڑا انتظار کر لینا چاہیے۔“

دوسرا مسافر بولا: ”بالکل، اگر یہی سب کچھ ہمارے ساتھ ہوتا تو ہم بھی یہی چاہتے کہ کوئی ہمارا ساتھ دے۔“

جلد ہی کئی مسافروں نے صارم کی حمایت میں آواز بلند کی۔ ڈرائیور تھوڑا جھجکا، لیکن جب دیکھا کہ زیادہ تر لوگ رُکنے کے حق میں ہیں تو اس نے بادلِ نخواستہ گاڑی روک دی۔

صارم جلدی سے گاڑی سے نیچے اترا اور اس خاتون کو تلاش کرنے کے لیے دوڑا۔ جلد ہی وہ خاتون عارضی قیام گاہ پہ بالکل اسی جگہ کھڑی نظر آئیں، جہاں پہلے بس موجود تھی۔ صارم نے اس خاتون کی گاڑی کی طرف رہنمائی کی، کیونکہ بس مقرّرہ جگہ سے کافی دور نکل چکی تھی۔

ان کے چہرے پر تھکن اور گھبراہٹ واضح تھی، ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں اور سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی گاڑی کے قریب پہنچیں اور یک دَم رُک کر خود کو سنبھالنے لگیں۔

ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے، جیسے وہ ایک بڑی مشکل سے نکل کر آئی ہوں۔ جب وہ قریب پہنچیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے، شاید گھبراہٹ، خوف اور شکر گزاری سب ایک ساتھ مل کر ان کے جذبات میں شامل ہو چکے تھے۔

”اللہ آپ سب کا بھلا کرے!“ وہ کپکپاتی آواز میں بولیں۔

”مجھے لگا تھا کہ گاڑی چلی جائے گی اور میں یہاں اکیلی رہ جاؤں گی، ان دونوں بچوں کے ساتھ۔“

وہ صارم کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں: ”بیٹا! تم نے مجھے زندگی کی بہت بڑی مصیبت سے چھٹکارا دلایا۔ اگر تم نہ ہوتے تو میں نہیں جانتی کہ کیا ہوتا۔ اللہ تمھیں خوش رکھے اور ہمیشہ زندگی کے ہر قدم پر کامیابیوں سے ہم کنار کرے۔“

صارم مسکرا دیا۔ اس کے اور سب مسافروں کے چہروں پر سکون اور خوشی کے آثار نمایاں تھے۔

بس لاہو کی طرف دوبارہ گامزن ہو چکی تھی۔ اسی اثنا میں باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔ کھڑکی سے باہر بارش کے پہلے قطرے زمین پر گرتے دیکھ کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

”بارش کا پہلا قطرہ۔۔۔“ اس نے خود سے کہا۔

ہاں، اسی ایک قطرے سے بادل برسنے لگتے ہیں، زمین سیراب ہو جاتی ہے اور ہر چیز نکھر کر تازہ دَم ہو جاتی ہے۔ آج اس نے بھی نیکی کا پہلا قطرہ بن کر ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ پہلے پہل وہ اکیلا بولا تھا، مگر اس کی آواز کئی دلوں میں اتر گئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ نیکی کا آغاز اکثر تنہا ہی کرنا پڑتا ہے، مگر جب خلوص شامل ہو تو کارواں خود بخود بننے لگتے ہیں۔

آج صارم کے دل میں ایک نیا اعتماد اور خوشی کا احساس تھا۔ ایک چھوٹا سا عمل کسی کے لیے کتنا بڑا فرق لا سکتا ہے، اس کا اندازہ آج ہوا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے ہر شخص کی نظروں میں اس کے لیے ایک خاص احترام محسوس ہو رہا تھا۔

عبادت کا حقیقی مفہوم

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (ذاریات:56) اس آیت پاک میں عبادت کا وہ مفہوم مراد نہیں، جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے، بلکہ وہ تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں تک وسیع ہے، جن کے کرنے کا مقصد، خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار، اس کی اطاعت اور اس کی خوشنودی کی طلب ہو۔ اس وسعت کے اندر، انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہیں، جن کے بحسن وخوبی انجام دینے کے لیے اس کی خلقت ہوئی ہے۔ یہ روحانیت کا وہ راز ہے، جو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے سے دنیا کو معلوم ہوا۔ (سیرت النبی ﷺ)

شانی کے جوتے۔۔۔

حفصہ محمد فیصل

مون سون کا موسم تھا، ہر وقت رم جھم لگی رہتی تھی۔ آج مینہ خوب برس رہا تھا۔

شانی ایک نشیبی علاقے میں اپنے دادا جان کے ہم راہ رہتا تھا۔ شانی کو بارش کا موسم بہت پسند تھا اور وہ اپنے جوتوں میں ادھورے پاؤں ڈالے چھپاک چھپاک کی آواز کے ساتھ صحن میں بارش کے جمع ہوتے پانی میں چھلانگیں لگا رہا تھا۔ گندے پانی کے چھینٹے اس کے ارد گرد اڑتے ہوئے اس کے چہرے تک آرہے تھے اور ایسا کرنے میں اسے بہت زیادہ مزا آرہا تھا۔ دادا جان کمرے میں بیٹھے یہ سارا منظر تحمل سے دیکھ رہے تھے۔ وہ مار کے بجائے پیار سے شانی کو سدھارنا چاہتے تھے۔

شانی چھپاک چھپاک کی آواز سے خوب محظوظ ہو رہا تھا۔ نشیبی علاقہ ہونے کی وجہ سے مینڈک بھی نکل آئے تھے اور اب وہ جگہ جگہ ٹرٹراتے پھر رہے تھے۔ شانی تقریباً ایک گھنٹے سے اس کھیل میں مصروف تھا۔

"شانی بیٹا! اب اندر آجائیے!" دادا جان نے پیار سے پکارا۔

دادا جان بس دس منٹ اور۔۔۔ شانی نے لاڈ سے کہا اور پھر دس منٹ بعد شانی میاں گندے کیچڑ سے لتھڑے جوتوں سمیت کمرے میں داخل ہوئے۔ دادا جان ایک لمحے کے لیے غصہ ہوئے، لیکن پھر خود پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگے۔

"بیٹا! ان جوتوں کو باہر رکھیے اور آپ غسل خانے میں جا کر کپڑے تبدیل کیجیے، میں جب تک کھانا گرم کر کے لاتا ہوں۔" دادا جان یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

شانی نے جوتے وہیں بستر کے پاس ہی اتارے، جلدی سے کپڑے بدلے اور بستر پر لیٹ گیا۔

تھکان کے باعث فوراً ہی آنکھ لگ گئی۔

"آجاؤ بیٹا! کھانا کھالو۔" دادا جان کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔ مگر شانی صاحب تو سو چکے تھے۔ گندے جوتے بستر کے قریب ہی پڑے تھے اور گیلے کپڑے بھی صوفے پر ڈال دیے گئے تھے۔ دادا جان نے گیلے کپڑے تو اٹھا کر الگنی پر ڈال دیے، لیکن گندے جوتے دیکھ کر ان کی نفیس طبیعت کو کراہیت محسوس ہوئی اور وہ شانی کی ہدایت کی دعا کرتے ہوئے بتی بجھا کر اپنے کمرے میں چل دیے۔

ٹررر، ٹرررر۔۔۔ رات بھر مینڈکوں کے ٹرٹرانے کی آوازیں گونجتی رہیں، شانی کی آنکھ صبح سویرے ہی کھل گئی۔ چوں کہ رات کو کچھ کھایا نہیں تھا، اس لیے پیٹ میں چوہے دوڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے سوچا دادا جان تو شاید نماز کے لیے گئے ہوں گے، میں خود ہی باورچی خانے سے کچھ لے کر کھا لیتا ہوں۔ بستر کے قریب ہی اپنے گندے جوتے دیکھ کر شانی نے انھیں پیروں میں اڑسنا چاہا، مگر جیسے ہی شانی نے جوتے میں پاؤں ڈالا تو کسی چیز نے اس کی انگلی پر کاٹ لیا۔ شانی کی چیخ بلند ہوئی اور اسی وقت دادا جان گھر کا تالا کھولتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

"کیا ہوا بچے؟؟؟" دادا جان پریشانی سے شانی کے کمرے کی جانب بڑھے۔

"اُوں، اُوں۔۔۔" شانی اپنے پاؤں کی انگلی سے رِستے خون کو دیکھتے ہوئے رو رہا تھا۔

"دادا جان اس جوتے نے مجھے کاٹ لیا۔" دادا جان حیرت سے جوتے کو دیکھنے لگے، پھر کچھ سمجھتے ہوئے انھوں نے جوتے کو قریب پڑی ایک لکڑی سے ہلایا تو ایک مینڈک ٹرٹراتے ہوئے اس میں سے نکلا اور دروازے کی سمت بھاگا۔

"مینڈک جوتے میں!" شانی حیرت سے بولا۔

"جی بیٹا! آپ نے رات کو نہ جوتے جھاڑے نہ صاف کیے اور نہ انھیں صحیح جگہ پر رکھا اور یہ مینڈک ان گندے جوتے میں آرام کرنے چھپ گیا۔" دادا جان نے مسکرا کر شانی کو دیکھا۔

"آؤ! میں دوا لگا دوں۔" دادا جان نے کہا۔

"مگر دادا جان اس طرح تو کوئی بھی موذِی جانور ہمارے جوتوں میں چھپ کر ہمیں تکلیف پہنچا سکتا ہے، اس کا کوئی حل ہونا چاہیے نا!" شانی نے سوالیہ انداز سے کہا۔

"بالکل۔۔ اس کا حل ہمارے پیارے نبی ﷺ کی سنّت پوری کرنے میں موجود ہے۔"

"اچھا!! وہ کیا۔" شانی تجسس سے بولا۔

ہمارے پیارے نبی ﷺ کی حدیث کا مفہوم ہے کہ:

"جوتے ہمیشہ جھاڑ کر اور بسم اللہ پڑھ کر پاؤں میں ڈالے جائیں، تاکہ کوئی موذِی تمھیں تکلیف نہ پہنچا سکے۔"

"اب میں بھی اس سنّت پر عمل کروں گا اور آپ مجھے دوسری بھی ایسی سنّتیں بتائیے گا۔" شانی نے دادا جان کے دل کی بات کہہ دی۔

"ان شاءاللہ!" دادا جان اور شانی نے ایک ساتھ کہا۔

اللہ تعالیٰ سے عدل نہیں، رحمت مانگیں

حضرت علامہ خالد محمود رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ عدل کا حکم دیتا ہے، تو عدل کرو اور زندگی کے ہر میدان میں عدل کرو، سوائے ایک کے کہ عدل مانگو نہیں۔ زندگی کے ہر دائرے میں عدل کو عمل میں لاؤ، لیکن عدل مانگو نہیں، بلکہ جب بھی اللہ سے مانگو تو اس سے رحمت مانگو۔ وہ عدل کرنے پر آ جائے تو کوئی بچ نہ سکے گا۔ یہ بعض لوگ جو کبھی قیدی ہوتے ہیں یا کبھی سیاسی مقدموں میں آتے ہیں تو اخبارات میں آتا ہے کہ وہ انصاف مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یااللہ انصاف فرما۔ تو لوگ جب خدا کی پکڑ میں آئیں اور لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے کہیں کہ جی یہ بڑے بے گناہ ہیں، یہ انصاف مانگتے ہیں، تو یاد رکھو خدا سے انصاف نہیں مانگا جاتا، خدا سے رحم مانگا جاتا ہے۔ ایک بات میں انسان قصور وار نہ ہو تو کسی دوسری بات میں قصور وار ہوگا، دوسری میں قصور وار نہ ہو تو کسی اور بات میں قصور وار ہوگا۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے جب بھی مانگو تو اس سے رحم مانگو۔ (خطبات علم وحکمت، ج1، ص154)

خوشی نگر کی سنہری دوڑ

مہوش اشرف

کسی دور افتادہ زمانے میں، سبزہ زاروں اور رنگ برنگے گھروں سے سجا ایک شہر تھا، جسے لوگ ”خوشی نگر“ کہتے تھے۔ اس شہر کی گلیاں ہمیشہ ہنسی سے گونجتی رہتیں اور فضا میں خوشبوؤں، قہقہوں اور اُمیدوں کی مہک بسی رہتی۔

ہر سال بہار کے آغاز پر خوشی نگر میں ایک بڑی دوڑ منعقد ہوتی، جسے سب سنہری دوڑ کے نام سے جانتے تھے۔ اس دن شہر کسی میلے کا منظر پیش کرتا۔ گلیوں پر جھنڈیاں لہرا رہی ہوتیں، ڈھولچی ڈھول بجاتے اور بچے ایک ہی بات کرتے نظر آتے: ”اس بار سنہرا ستارہ کس کے حصے میں آئے گا؟“

دوڑ کا انعام ایک چھوٹا سا مگر بے حد قیمتی ”سنہرا ستارہ“ تھا، جو سورج کی روشنی میں جگمگاتا اور جیتنے والے کے سینے پر فخر کی طرح چمکتا۔

اسی شہر میں دو گہرے دوست رہتے تھے۔۔۔ لیو شیر اور ممی بندر!!

لیو کا قد اونچا اور چال میں ٹھہراؤ تھا۔ وہ صبح سویرے ٹھنڈی ہواؤں میں دوڑ لگاتا، نرم گھاس پر قدم جما کر سانس کو قابو میں رکھتا۔ اسے معلوم تھا کہ کامیابی محنت مانگتی ہے۔

اس کے برعکس ممی کا دل کسی پرندے کی طرح بے قرار تھا۔ کبھی وہ درخت کی اونچی شاخ پر جھولتی، کبھی کسی تتلی کے پیچھے دوڑتی اور کبھی راستے میں پڑے کنکر اکٹھے کر لیتی۔ دنیا اس کے لیے ایک دل چسپ کھیل تھی۔

آخر وہ دن بھی آ پہنچا۔

دوڑ کے میدان میں لوگ جمع تھے۔ سورج ہلکا سا مسکرا رہا تھا، ہواؤں میں تازگی تھی، جیسے ہی سیٹی بجی، سب دوڑ پڑے۔

لیو کے قدم مضبوط تھے، زمین پر اس کی چاپ صاف سنائی دیتی تھی۔ ممی ہنستی ہوئی دوڑ رہی تھی، کبھی درختوں کے سائے میں، کبھی شاخوں سے جھولتی ہوئی۔

تھوڑی ہی دور ایک غباروں والا کھڑا تھا۔ ہوا میں تیرتے رنگین غبارے بچوں کو آواز دے رہے تھے۔ ممی رُک گئی۔

”لیو! دیکھو نا، جیسے قوسِ قزح آسمان سے اتر آئی ہو!“

لیو نے پیچھے مڑ کر مسکرا کر کہا، ”بعد میں دیکھیں گے، ممی! ابھی منزل بلاتی ہے۔“

ممی نے ایک آخری نظر ڈالی اور پھر دوڑ پڑی۔

آگے جا کر ڈھول کی آواز گونجی۔ ایک جلوس تھا۔ رنگین کپڑوں میں ملبوس رقاص، گھومتے قدم، ہنسی کی آوازیں۔ ممی کا دل بے قابو ہو گیا۔ وہ تال پر ہاتھ ہلانے لگی، ایک آدھ قدم ناچ بھی لیا۔

”کتنا مزہ ہے!“ وہ خوشی سے بولی۔

لیو لمحہ بھر کو رُکا، مگر اسے اپنی دادی کی نصیحت یاد آئی: ”جو ہر آواز پر رُک جائے، وہ اپنی آواز کھو بیٹھتا ہے۔“ وہ پھر دوڑ پڑا۔

راستے میں بسکٹوں کی خوشبو نے فضا کو میٹھا کر دیا۔ ایک جادوگر فضا میں رومال غائب کر رہا تھا۔ چمکتے کھلونے بچوں کو بلا رہے تھے۔ ممی ہر بار رُکتی، خوش ہوتی، مگر ہر خوشی کے بعد تھوڑی تھک بھی جاتی۔

آخر کار، لیو نے اختتامی لکیر پار کی۔ تالیوں کی بارش ہوئی۔ سنہرا ستارہ اس کے سینے پر چمک اٹھا۔z کچھ دیر بعد ممی پہنچی۔ پسینہ ماتھے پر تھا، آنکھوں میں ندامت۔

”میں سب کچھ دیکھنا چاہتی تھی۔“ اس نے آہستہ کہا اور اصل بات بھول گئی۔

لیو نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما۔

”کوئی بات نہیں۔ خوشی بھی ضروری ہے، مگر مقصد کے ساتھ۔“

چند ہفتے بعد ایک اور دوڑ ہوئی۔ اس بار ممی نے خود کو سنبھالا۔ جب کوئی تماشا دکھائی دیتا، وہ مسکرا کر کہتی، ”بعد میں!“

لیو بھی اس کے ساتھ قدم ملا کر دوڑتا رہا اور یوں دونوں ہنستے، سانسیں قابو میں رکھتے، ایک ساتھ منزل تک پہنچ گئے۔

زندگی ایک میلہ ہے، مگر کامیابی اس کے حصے میں آتی ہے جو دل کو خوشی اور نظر کو منزل پر رکھنا جان لے۔

بچوں کے فن پارے

آمنہ حسین ، 9 سال فیصل آباد

اسماعیل محسن ،8 سال ، فورٹ عباس

حورین لقمان ،8 سال ، لیاقت پور

زنیرہ فاطمہ ، پشاور

عنایا عمر ، 9 سال کراچی

ماریہ جبران ، 10 سال کراچی

محمد عمر ،12 سال ، رحیم یار خان

ہانیہ زبیر ،12 سال ملتان

ہر ماہ ایک فن پارہ انعامی قرار پاتا ہے۔ گزشتہ ماہ راول پنڈی سے **اسمارہ نور** کا فن پارہ انعامی قرار پایا ہے۔ انہیں 300 روپے مبارک ہوں۔ اس کے علاوہ تلنگانہ ریاست حیدر آباد ہندوستان سے **رمیصا فاطمہ** کا فن پارہ بھی بہت خوب تھا۔ انہیں بہت شاباش !!

ماہنامہ فہمِ دین
اپریل 2026ء کے سوالات

سوال 1: واجد کی اسکول سے غیر حاضری کی کیا وجہ تھی

سوال 2: احمد نے کس چیز سے متعلق خواب دیکھا تھا؟

سوال 3: شیرو کا مشیر کون تھا؟

سوال 4: نعمت کیا مانگتی ہے؟

سوال 5: ہانیہ کے انتقال کی وجہ کیا بنی؟

یہ سوالات مارچ 2026 کے فہم دین سے لیے گئے ہیں۔
جوابات کی آخری تاریخ 15 اپریل ہے

چھوٹی بات بڑا پیغام

چھوٹی سی بات

پیارے بچو!

فروری کے آخر یا مارچ کے شروع سے بہار کا آغاز ہوتا ہے جو اپریل کے آخر تک جاری رہتا ہے بلکہ کچھ بالائی علاقوں میں مئی کے کچھ دن بھی بہار ہی میں گزرتے ہیں۔ گویا اپریل کے مہینے میں بھی بہار کی خوبصورت خوشبو جاری رہتی ہے۔ موسمِ بہار میں درختوں پر نئی کونپلیں نکلتی ہیں، پھول کھلتے ہیں اور ہر طرف تازگی محسوس ہوتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ جیسے درخت بہار میں نئی زندگی پاتے ہیں، ویسے ہی ہم بھی اپنی زندگی میں نئی اچھی عادتیں شروع کر سکتے ہیں؟

یہ مہینہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہر نیا دن ایک نیا موقع ہے۔ آیئے ہم فیصلہ کریں کہ ہم سچ بولنے، وقت کی پابندی کرنے، والدین اور اساتذہ کا احترام کرنے اور دل لگا کر پڑھنے کی عادت اپنائیں گے۔ چھوٹی چھوٹی اچھی عادتیں ہی ہمیں ایک اچھا انسان بناتی ہیں۔

کیوں نہ ہم سب یہ وعدہ کریں اور اس کو نبھانے کی بھی کوشش کریں کہ اِس موسم بہار میں اپنے دل اور کردار میں بھی نیکیوں کے خوبصورت پھول کھلائیں گے۔

مارچ 2026ء کے سوالات کا درست جواب دینے پر اسلام آباد سے سفیان سلیم انعام کے حق دار ٹھہرے ہیں۔

مارچ 2026ء کے سوالات کے جوابات

1- سرمد کے جوتے میں سے

2- 27 گُنا

3- سات

4- پورے مہینے کے

5- صائم پری

سنیے!!!!

انعامی سوالات کے جوابات بھیجنا ہوں یا فن پارہ، اپنا نام، عمر، کلاس اسکول/مدرسے کا نام اور رابطے کے لیے موبائل نمبر ضرور لکھیں۔ جوابات اور فن پارہ بھیجنے کے لیے ای میل اور وٹس ایپ نمبر نوٹ کرلیں:

tabeer1387@gmail.com

+923351135011

بلند اوصاف سے وُسطیٰ، انہیں کندن بنانا ہے

حافظہ وُسطیٰ چودھری

کوزہ گر!

یہ کچی نرم مٹی کوزہ گر! تیری وراثت ہے
ہے فن کا امتحاں تیرے، عجب اس میں نزاکت ہے
بہت ہی نرم ہاتھوں سے، توجہ اور مہارت سے
بنانا ہے حسیں سانچہ، تجھے صبر و ریاضت سے
گھمانا چاک پر ایسے، توازن ہی نہ کھو جائے
سنبھل کر تو اسے چھونا، کہیں ایسا نہ ہو جائے
کہ اک لمحے کی غفلت سے، تری محنت اکارت ہو
تری سختی کی شدت سے، ہنر اک پل میں غارت ہو

معمار!

تجھے معمار! کرنا کام ہے زیرک نگاہی سے
بچانا ہے عمارت کو ہر اک ممکن تباہی سے
کسی نقشے پہ جب بھی کچھ نیا تعمیر کرنا ہے
عقیدہ دل کی تختی پر یہی تحریر کرنا ہے
کہ پہلی اینٹ رکھنے سے بھی پہلے یاد ہے رکھنا
خدا اول، نبی ﷺ آخر، اسے بنیاد ہے رکھنا
تجھے محتاط ہے رہنا، نقب کوئی لگا جائے
نہ کوئی چور رستہ گھر کے اندر تک ہی آ جائے

رہ نما!

بڑی لمبی مسافت ہے، کٹھن یہ زندگانی ہے
اے رہ بر، رہ نما تجھ کو ہی کرنی پاسبانی ہے
شعورِ ذات کی مشعل تو راہی کو تھما دینا
نہ اپنی ذات کو اس کی، تو بیسا کھی بنا دینا
اپاہج بن کے رہ جائے، نہ منزل تک پہنچ پائے
بِنا ھتامے تری انگلی، نہ چلنا ہی اسے آئے
نہ بے جا ڈھیل ہی دینا، قدم اس کے پھسل جائیں
طلسماتی فتن سے پُر، سراب اس کو نگل جائیں

باغباں!

نگہباں! باغباں! حق تیرا ہے گلشن کی مٹی پر
ہر اک غنچے پہ ڈالی پر، ہر اک ہی پھول پتی پر
انہیں الفت کا پانی دے، گھنی چھاؤں محبت کی
یہ پودے کھل اٹھیں گے، جب پڑے گی دھوپ شفقت کی
سلیقے سے تراش ایسے، کہ ان کے قد نکل آئیں
بچا آندھی سے طوفاں سے، نہ جڑ سے یہ اکھڑ جائیں
تری بے خبری سے پتے، نہ ان کے زرد پڑ جائیں
نمو ان کی نہ رک جائے، یہ اندر سے نہ مر جائیں

◆◆◆

مسافر، مٹی، غنچے، گل، عمارت استعارے ہیں
حقیقت میں تو یہ ماں باپ کی آنکھوں کے تارے ہیں
امیں ہو تم، عطا ہیں یہ، فریضہ یوں نبھانا ہے
بلند اوصاف سے وُسطیٰ، انہیں کندن بنانا ہے

سر پہ چادر سویرا یہ دائم رہے

حافظہ سویرا چودھری

ہے سمندر کی تہ میں جو موتی پڑا
موجِ طوفاں کے آگے وہ ڈٹ کر کھڑا
کہنے کو وہ گُہر تو اندھیرے میں ہے
ایک پردے کے دل کش سے گھیرے میں ہے
خول کی خود پہ چادر لپیٹے ہوئے
اپنے جلووں کو سب سے سمیٹے ہوئے
کھل کے لہروں سے ملتا تو کیا بات تھی؟
عام پانی کے قطرے سی اوقات تھی
بے حجابی سے اس نے کنارہ کیا
گہری تنہائی کو ہے گوارا کیا
آج حسن و کشش کا وہ معیار ہے
اک زمانہ بھی اس کا طلب گار ہے

طاق میں اک دیا ہے چمکتا ہوا
قلبِ فانوس میں ہے دھڑکتا ہوا
آندھیوں سے ہے خود کو بچائے ہوئے
کانچ کے پیرہن میں سمائے ہوئے
حد سے باہر جو نکلے تو کیا شان ہو؟
شعلہ بے جان ہو اور نقصان ہو
ڈھال کو گر وہ خود سے ہی دیتا ہٹا
اپنی ہستی کو لمحوں میں کرتا فنا
وہ رہا بن کے اندر چراغِ سحر
ظلمتوں کا نہ اس پر ہوا کچھ اثر
بند شیشے میں ہی اس کا اعزاز ہے
شمع فانوس میں کتنی ممتاز ہے

پیاری بہنا! یہ قدرت کا دستور ہے
بیش قیمت جو شے ہے وہ مستور ہے
کر دیا رب نے عورت کو ہے معتبر
کیوں اٹھے اس کی جانب کسی کی نظر؟
چاہیے اس کو بچ کر رہے ہر جگہ
تاکہ پہنچے نہ اس تک کسی کی نگہ
سیپ کے خول میں جیسے موتی نگیں
پردے میں ہی رہے اس کی روشن جبیں
سلسلہ جو حیا کا ہے قائم رہے
سر پہ چادر سویرا یہ دائم رہے

قلم پارے

ترتیب: محمود سیماب

مختصر و پُر اثر تحریروں کا سلسلہ، اس ماہ کراچی سے حفصہ محمد فیصل کی تحریر عبادات و معاملات انعامی قرار پائی ہے

عبادات و معاملات

حفصہ محمد فیصل کراچی

کاش! ہم عبادات و معاملات سمجھ کر عمل کر سکیں۔

عبادات.. حقوق اللہ

معاملات۔۔۔حقوق العباد

لوگ عبادات لمبی چوڑی کر لیتے ہیں لیکن معاملات میں کورے ہوتے ہیں۔ان کے کھاتے میں حج، عمرے، نوافل تو کثرت سے ہوتے ہیں لیکن رشتے داروں، پڑوسیوں، گاہکوں وغیرہ کو اپنے فعل سے ایذا دیتے ہیں اور انہیں احساس تک نہیں ہوتا۔ کبھی کسی کا حق مار لیا، کبھی کسی کو دھوکا دے دیا، کسی کو پریشان کر دیا۔ حالاں کہ عبادات سے زیادہ معاملات میں زیادہ پکڑ کا اندیشہ ہے لیکن اس پر توجہ ہی نہیں۔ یہ ایک ایسا فعل ہے جو ہمارے معاشرے میں بتدریج پھیلتا جا رہا ہے۔ اللہ پاک درست سمجھ عطا فرمائے۔ آمین

والدین کی قدر: جنت کا راستہ

محمد اقبال کراچی

والدین اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم نعمت ہیں جن کا کوئی نعم البدل نہیں۔ قرآن میں اللہ تعالی نے اپنی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ ماں کے قدموں تلے جنت اور باپ کی رضا میں رب کی رضا بتائی گئی ہے۔ ان کی خدمت محض اخلاقی فریضہ نہیں بلکہ نجات کا ذریعہ ہے۔ ان کے بڑھاپے میں ان کی دلجوئی کرنا، انہیں ”اُف“ تک نہ کہنا اور ان کے لیے دعائے خیر کرنا اولاد کی ذمہ داری ہے۔ خوش نصیب ہے وہ جو والدین کی خدمت کر کے رب کو راضی کر لے۔

شکر: نعمتوں میں اضافے کا ذریعہ

عبدالمجید لاہور

شکر صرف زبان سے ”الحمدللہ“ کہنا نہیں، بلکہ دل سے نعمت دینے والے کی عظمت کا اعتراف اور ان نعمتوں کو اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کرنا ہے۔ اللہ کا فرمان ہے: ”اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا۔“ ایک شکر گزار بندہ ہر حال میں مطمئن رہتا ہے کیونکہ اس کی نظر محرومیوں پر نہیں بلکہ رب کی عنایات پر ہوتی ہے۔ شکر گزاری انسان کے اندر سے حسد اور ناشکری کی بیماریوں کو ختم کر کے اسے ذہنی اور روحانی سکون عطا کرتی ہے۔

حج: عشقِ الٰہی کا سفر

دردانہ غلام رسول حیدر آباد

حج عالمِ اسلام کے اتحاد اور عظمت کی علامت اور اسلام کا وہ عظیم رکن ہے جو مالی اور جسمانی عبادت کا حسین امتزاج ہے۔ یہ سفرِ عشق بندے کو گناہوں کی آلائشوں سے پاک کر کے اللہ تعالی رحمٰن و رحیم کے قریب کر دیتا ہے۔ میدانِ عرفات میں لاکھوں انسانوں کا ایک ہی لباس (احرام) میں جمع ہونا قیامت کی یاد دلاتا ہے اور مساواتِ انسانی کا عملی درس دیتا ہے۔ جس شخص کا حج مقبول ہو جائے، وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو کر لوٹتا ہے جیسے آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔

دعا: بندگی کا مغز

رُخسانہ فہیم بالا کوٹ

دعا بندے کا اپنے خالق سے براہِ راست مکالمے کا نام ہے۔ حدیثِ مبارکہ کے مطابق ”دعا عبادت کا مغز ہے۔“ جب انسان اپنے ہاتھ رب کے حضور پھیلاتا ہے، تو وہ دراصل اپنی عاجزی اور اللہ سبحانہ و تعالی کی کبریائی کا اعتراف کر رہا ہوتا ہے۔ اللہ کو اپنے بندے کا مانگنا بہت پسند ہے اور وہ کبھی کسی سائل کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔ دعا نہ صرف تقدیر بدلنے کی طاقت رکھتی ہے، بلکہ یہ مومن کے لیے سکونِ قلب اور مصیبتوں سے بچاؤ کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔

منتخب اشعار

انتخاب محمد عقیل سلیم

ہاں سچ ہے، تمھاری تو بلا ہی جانے
جو گزرتی ہے میرے دل پہ خدا ہی جانے
(شاعر: بقا اکبر آبادی)

رقیبوں کا مجھ سے گلا ہو رہا ہے
یہ کیا کر رہے ہو یہ کیا ہو رہا ہے
(شاعر: بے خود بدایونی)

نمک بھر کر میرے زخموں میں تم کیا مسکراتے ہو
مرے زخموں کو دیکھو مسکرانا اسے کہتے ہیں
(شاعر: بے خود دہلوی)

حضورِ یار بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں
(شاعر: محمد دین، تاثیر)

دیکھے ہیں بہت ہم نے ہنگامے محبت کے
آغاز بھی رسوائی، انجام بھی رسوائی
(شاعر: صوفی غلام مصطفیٰ تبسم)

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے
(شاعر: ثاقب لکھنوی)

نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری عجب کچھ دور آیا ہے
(شاعر: میر جعفر زٹل)

اللہ رے چشم یار کی معجز بیانیاں
ہر ایک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے
(شاعر: جگر مرادآبادی)

آتے آتے آئے گا، ان کو خیال
جاتے جاتے بے خیالی جائے گی
(شاعر: جلیل، مانک پوری)

بچوں پر شفقت

جہانگیر رضا

اولاد اللہ تعالیٰ کی جانب سے والدین کے لیے نعمت اور امانت ہوتی ہے۔ نعمت اور امانت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی تربیت کا اہتما کیا جائے اور اس بابت شفقت اور محبت کا اسلوب اختیار کیا جائے۔ ضرورت پڑنے پر شریعت کی دی گئی تعلیم کے مطابق کبھی کبھار کچھ سختی کی گنجائش بھی نکلتی ہے تاہم سختی میں نفرت کا پہلو شامل نہیں ہونا چاہیے۔

نبی کریم ﷺ بچوں پر بے انتہا شفقت فرماتے؛ انہیں سلام کرنے میں پہل کرتے، سواری پر اپنے ساتھ بٹھاتے اور ان کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آتے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے۔" بچوں کی بہتر تربیت، ان کی حوصلہ افزائی اور ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ ایک صحت مند معاشرے کی بنیاد ہے۔ محبت اور شفقت سے پروان چڑھنے والے بچے ہی مستقبل کے بہترین انسان بنتے ہیں۔

حیا: ایمان کا زیور

منیبہ احسان کراچی

حیا وہ پاکیزہ صفت ہے، جو انسان کو برائی سے روکتی اور نیکی پر ابھارتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "حیا ایمان کا ایک اہم شعبہ ہے۔" جس معاشرے سے حیا ختم ہو جائے، وہاں اخلاقی اقدار دم توڑ دیتی ہیں۔ حیا صرف آنکھ کا پردہ نہیں، بلکہ خیالات، گفتگو اور کردار کی پاکیزگی کا نام ہے۔ ایک باحیا انسان تنہائی میں بھی اللہ کے حضور جوابدہی کے احساس سے سرشار رہتا ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتی اور اسلامی معاشرے میں عفت و عصمت کا تحفظ کرتی ہے۔

صبر: کامیابی کی کنجی

محمودہ فرخ رحیم یار خان

زندگی آزمائشوں کا نام ہے اور ان حالات میں خود کو ثابت قدم رکھنا "صبر" ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں کو اپنی معیت کی خوشخبری دی ہے۔ صبر کا مطلب بزدلی یا خاموشی نہیں، بلکہ مصیبت کے پہلے جھٹکے پر اللہ کی رضا میں راضی رہنا اور جزع فزع سے بچنا ہے۔ جو شخص تلخ حالات میں صبر کا دامن نہیں چھوڑتا، اللہ اس کے لیے آسانیاں پیدا فرما دیتا ہے۔ یاد رکھیے! صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے اور یہ مومن کا بہترین ہتھیار ہے۔

بیت السلام کا تعلیمی وژن
رجال کار کی تیاری کا مشن

تحریر
طارق محمود

ملک وملت کی رہ نمائی کے لیے افرادِ کار، رجالِ کار، ہر شعبے کے ماہرین کی تیاری جتنی بڑی ضرورت اور اس کی اہمیت ہے اتنا ہی بڑا چیلنج بھی۔ بیت السلام کا تعلیمی وژن نہ صرف اس ضرورت اور اہمیت کو سمجھ رہا ہے بلکہ افراد کار کی تیاری کا مشکل ترین چیلنج بھی اس نے قبول کیا ہوا ہے اور اس پر بڑی ثابت قدمی سے عمل پیرا ہے۔ چناں چہ بچوں کی عمر کے بالکل ابتدائی حصے سے لے کر لڑکپن، نوجوانی، جوانی تک تعلیم و تربیت کے مختلف سلسلے جاری و ساری ہیں۔ ابتدائی دینی اور بنیادی عصری تعلیم سے لے کر قرآن و حدیث اور فقہ جیسے دینی علوم کے ساتھ طلبہ پر سائنس، ٹیکنالوجی سمیت متعدد علوم وفنون میں مہارتوں کے لیے خصوصی توجہ اور تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان تعلیمی سلسلوں پر ایک اجمالی نظر ملاحظہ ہو:

- عربی میڈیم مونٹیسوری: ننھے منے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ۔
- مسجد اسکول: حفظ قرآن کی سعادت کے ساتھ میٹرک تک تعلیم دس مقامات پر جاری ہے اور ملک بھر میں یہ سلسلہ وسیع کیا جا رہا ہے۔
- بیت السلام ایجوکیشنل سینٹرز: منظم سافٹ وئیر سے مربوط ایک ایسا سلسلہ، جو ملک بھر کے انتہائی پس ماندہ علاقوں میں بھی کام کر رہا ہے۔ اس سلسلے کے تحت بنیادی اور عصری تعلیم دینے کے 415 ادارے فعال ہیں۔ جن میں جی پی ایس ٹریکنگ کی سہولت ہے اور تعلیم و تعلم، تربیت و خدمت کا یہ سارا نظم جدید سافٹ وئیر سے منسلک ہے،
- دی انٹیلکٹ اسکول: مونٹیسوری سے لے کر اولیول اور اے لیول کے طلبہ وطالبات کے لیے الگ الگ درس گاہوں سمیت تمام ضروری سہولیات سے آراستہ منفرد ادارہ۔
- انٹیلکٹ کیڈٹ کالج: جی ایچ کیو سے منظور شدہ درجہ اول کا معیاری کیڈٹ کالج، جس کا مشن علامہ اقبال کے نظریات کی روشنی میں خودی اور مشرقی اقدار سے روشناس ایسے رہ نما تیار کرنا ہے جو ملک وملت کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔
- بیت السلام ایجوکیشنل کمپلیکس ساؤتھ و نارتھ کیمپس: یہاں مفت درس نظامی، اسپیشل کورسز، حفظ قرآن، او، اے لیول، میٹرک اور ایف ایس سی کی معیاری تعلیم اعلی تربیت کے ساتھ دی جاتی ہے، رہائش، خوراک۔ علاج اور تعلیمی سہولیات کے ساتھ ساتھ ضروریات زندگی کی مفت فراہمی ہوتی ہے۔
- بیت السلام اسٹم اسکول: سائنس، ٹیکنالوجی، انجینیرنگ اور میتھ میٹکس میں خصوصی مہارت کی تعلیم کا سسٹم، غیر معمولی ذہانت رکھنے والے بچوں کے لیے یہ سلسلہ جاری ہے۔ الحمدللہ!!
- مرکز فہم دین: خواتین کے لیے متعدد تعلیمی مراکز ملک بھر میں کام کر رہے ہیں جہاں خواتین نہ صرف تعلیم حاصل کر رہی ہیں بلکہ مضبوط خاندانی اقدار بھی سیکھ رہی ہیں۔
- ای جامعہ بیت السلام وای بیت السلام: حضرات وخواتین کے لیے آن لائن تعلیمی سلسلہ جس میں مختصر اور طویل دورانیے کے متعدد کورس جاری رہتے ہیں۔

عالمی ادارہ بیت السلام ویلفیئر ٹرسٹ

BAITUSSALAM

سستی روٹی پراجیکٹ

لاکھوں روٹیاں مستحقین تک

5 روپیہ صرف عزت نفس کی خاطر

سپر فائن آٹا براہ راست بیت السلام ویئر ہاؤس بھی پہنچا سکتے ہیں کم سے کم 50 کلو

J.
FRAGRANCES
WASIM AKRAM
502
PLATINUM
WEAR THE LEGEND.
WASIM AKRAM
502
PLATINUM
www.junaidjamshed.com
J.Fragrances.Cosmetics
J.Fragrances.Cosmetics
J_Frag_Cos
J.JunaidJamshed